سلسلۂ اشاعتِ امامیہ مشن پاکستان رجسٹرڈ لاہور نمبر ۱۰

نظامِ زندگی

حصۂ اوّل

از قلم

سید العلماء مولانا سید علی نقی النقوی مجتہد العصر

قیمت ۱۲ آنے

محصول ڈاک

کامیاب زندگی کا راز

آج کے مشینی دور میں ہر ملک کے اندر اگرچہ مشینوں کا استعمال عام ہے مگر کیا ہر مشین کو استعمال کرنے کے لئے ہر ایک مکینک آزاد ہے ؟ ایسا ہرگز نہیں - بلکہ اس کے استعمال میں ان ہدایات کی پابندی لازمی ہے جو مشین ساز انجینئر نے مشین کے ہر ایک پرزے کے تخلیقی عناصر اور مقصدیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے متعین کی ہیں - یہ ہدایت نامہ ہر ایک مشین کا جزو لائنیفک ہے اگر ان ہدایات پر عمل نہ کیا جائے تو مشین اپنے مقصد تخلیق کو پورا نہ کر سکے گی - جس کی ذمہ داری غلط استعمال کرنے والے پر آئیگی -

کائنات کا کل سربد انسان بجائے خود ایک بےمثل و بے نظیر اعلیٰ درجہ کی مکمل مشین ہے اور اس بہترین مشین کی کامیابی کا راز اس نظام زندگی میں پوشیدہ ہے جو اس کے خالق، خدائے علیم و بصیر نے اپنے ہدایت نامہ "قرآن و سنت" ہی تجویز کیا ہے اور جس کے عملی مفسر ائمہ اہل بیت رسول علیہم السلام ہیں -

زندگی میں کامیابی کے متلاشیوں کو لازم ہے کہ ان ہدایات پر عمل کریں ورنہ ناکامی کے ذمہ دار وہ خود قرار پائینگے -

زندگی کو خوشگوار اور کامیاب بنانے کے لئے زیر نظر رسالہ "نظام زندگی" میں کچھ سنہری ہدایات درج کر دی گئی ہیں جن پر عمل کرنے کے بعد جب اس کا خوشگوار نتیجہ آپ کے سامنے آئیگا - تو آپ بے اختیار پکار اٹھینگے : "صدق اللہ و صدق الرسول"

بحمد اللہ میں تجربہ سے فائدہ اٹھا چکا ہوں ناظرین کو تجربہ کرنے کی پر زور سفارش کرتا ہوں -

خادم دین سید حسن علی شاہ کاظمی

سیکرٹری امامیہ مشن پاکستان (رجسٹرڈ) اردو بازار - لاہور

سلسلہ اشاعت امامیہ مشن پاکستان رجسٹرڈ لاہور نمبر ۱۰

نظامِ زندگی

حصّہ اوّل

مصنّفہ

حضرت سیّد العلماء مولانا سیّد علی نقی النقوی مجتہد العصر دام ظلہ

قیمت ۱۲/

محصول

امامیہ مشن پاکستان رجسٹرڈ لاہور

کی تبلیغی خدمات کا دسواں شاہکار نظام زندگی حصہ اول آپ کے پیش نظر ہے! امامیہ مشن لکھنؤ نے اس اہم اور مفید سلسلہ کو چار حصوں میں شائع کیا ہے۔

اسلام کی فطری اور عالمگیر تحریک کو کامیابی سے آگے بڑھانے کی ذمہ داری سنبھالنے کیلئے مخصوص مزاج و کردار کے افراد کی ضرورت ہے انکی تعلیم و تربیت کی سنہری ہدایات اس میں درج ہیں۔ مفکرین کا اسمیں اختلاف ہے کہ تشکیل سیرت اور تعمیر کردار کیلئے تعلیم کی ابتدا زندگی کے کس نقطہ سے شروع ہونا چاہئے۔ اسلام کا نظام تربیت تجویز کرتا ہے کہ انسان کو نیک اور پاکباز بنانے کے تربیتی پروگرام کی ابتدا پیدائش سے بہت قبل ہیولائے تصورات کے نقش خیالی سے شروع ہونا چاہئے جبکہ حصول اولاد کیلئے شادی کی تمنائیں تخیلات کی گود میں کروٹیں لینا شروع کرتی ہیں۔ بعدہٗ ہر ہر منزل کیلئے مناسب وقت ہدایات دیکر نظام زندگی کو اس خوبصورتی سے مکمل کرتا ہے، کہ عقل کو اسلام کی اکملیت پر ایمان لائے بغیر چارہ نہیں رہتا۔ مجتہد العصر نباض دہر ناشر علوم اسلام سرکار سید العلماء مدظلہ کے ذمہ دار قلم کا یہ مفید سلسلہ خدمت اسلام کا گرانقدر شاہکار ہے جس میں خود فراموش مسلمانوں کو انکا بھولا ہوا سبق یاد دلاتے ہوئے اسلامی تعلیم و تربیت، عبادات، معاملات، عورت مرد کے الگ الگ وظائف حیات کیلئے انکا جداگانہ نصاب تعلیم و تربیت، زندگی میں مذہب کی اہمیت اسلامی عقاید کی ہمیشہ افادیت عقاید و اعمال کا باہمی ربط بڑے دلکش اور روح پرور طریقہ سے بیان فرمایا ہے انھوں نے مسلمانوں کو کتنا نتیجہ خیز مشورہ دیا ہے کہ جن عقاید کی ہم زبان سے تبلیغ کرتے ہیں ہمارے اعمال و افعال کو انکا ترجمان ہونا چاہئے اس مفید رسالہ کے مطالعہ سے اسلامی طرز تربیت کی فوقیت ان مغربی طرز کی تربیت گاہوں پر مسلم ہو جائیگی جن سے فارغ شدہ بچے مذہبی گرفت اور روحانی فیض سے محروم رہ کر تمام عمر پریشان خیالی اور روحانیت کی کیف آور اطمینانی زندگی کو ترستے رہتے ہیں کیونکہ مدینہ اور شاہ نجف کے حیات بخش چشموں سے انکا ذہنی سلسلہ کمزور کر دیا جاتا ہے۔

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف (اقبال)

مومنین سے گزارش ہے کہ اس قابل فخر رسالہ کو بنظر عمیق مطالعہ فرما کر زیادہ سے زیادہ توسیع اشاعت سے امامیہ مشن پاکستان کا ہاتھ بٹائیں۔ والسلام

خادم دین سید حسن علی شاہ کاظمی آنریری سیکرٹری امامیہ مشن پاکستان رجسٹرڈ۔ اردو بازار لاہور۔ جنوری ۱۹۵۶ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی سَیِّدِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ وَاٰلِہِ الطَّاہِرِیْنَ

تمہید

اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَکَ سُدًی

انسان کا یہ خیال غلط ہے کہ وہ دنیا میں یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا۔ "یوں ہی" یعنی بغیر کسی نظم و قاعدہ اور آئین و قانون کے۔

بے نظم و بے اصول تو چھوڑا اس وقت جا سکتا تھا جب اس کا خالق ناسمجھ اور غیر ذی شعور ہوتا یا نظم و قانون کے عمل میں لانے سے عاجز ہوتا دنیا کی ہر شے میں نظام قائم ہے۔ اور یہ اسی نظام ہی کا نتیجہ ہے کہ دنیا میں علوم و فنون کی بنیاد قائم ہوئی ہے۔ وہ چاہے طب ہو اور چاہے سائنس، علم النباتات ہو یا علم الحیوانات جو بھی اس طرح کا فن ہو اس کی حقیقت صرف نظام کائنات کے سمجھنے پر منحصر ہے۔

علوم کی بنیاد کلیات پر ہوتی ہے اور کلیات قائم ہی نہیں ہو سکتے۔ جب تک کہ باضابطہ نظام موجود نہ ہو، اتفاقیات کا کوئی

معیار نہیں ہوتا۔ اس لئے اُن کے دیکھنے سے بطور کلیہ کوئی اصول قائم نہیں ہو سکتا۔

پھر جب ہر شے با اصول ہے اور نظام کے تحت میں ہے تو یہ انسان غیر منظم اور بے اصول کیوں ہو۔

بس فرق اتنا ہے کہ ان تمام چیزوں کا نظم و ارتباط خالق عالم نے بالکل اپنی قوّت اور ارادہ کے ماتحت رکھا ہے، لیکن انسان کو "انسان" بنانا تھا اور اس کی انسانیت اپنی اختیاری طاقتوں کے عمل میں لانے سے وابستہ ہے، اس لئے اس کے افعال و اعمال کے نظم و آئین کو اس کے ارادۂ و اختیار سے وابستہ قرار دیا اور اپنی جانب سے اس نے اس بارے میں حکمرانی اور ہدایت پر اکتفا کی یعنی تمام دوسری چیزوں کا انتظام ارادۂ "تکوین" سے متعلق اور انسان کا انتظام ارادۂ "تشریع" سے متعلق ہے۔

بے شک احکامِ شرعیہ کے تحت میں ہر طرح اس انسان کی عملی زندگی کے آراستہ بنانے کا انتظام کیا گیا اور انسان کے ہر دورِ حیات سے متعلق اس طرح اہتمام کیا گیا کہ یہ انسان صحیح طور پر ایک نظام و اصول اور آئین کا پابند ہو اس کے لئے اس نے شرعی ہدایات کے ذریعہ سے ایک مکمّل "نظام نامۂ زندگی" یا "دستور العمل حیات" ہم تک پہنچا دیا۔ جس کے پورے طور پر پابند ہونے ہی میں ہماری اصلاح اور کامیابی مضمر ہے ۔

نظامِ زندگی کی ابتدائی داغ بیل

اس کے انتظامات کب سے شروع ہوئے؟ اہل مذہب اس سلسلہ میں بڑی دُور کا پتہ دیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ جب ہر انسان کی روح کا جسم سے تعلق بھی نہیں ہوا تھا اس وقت روح کو سبق پڑھائے گئے اور اس سے عہد و پیمان لئے گئے تھے۔ اُسے "عالم ذر" کے نام سے یاد کرتے ہیں اور قرآن میں اُس پیمان کا تذکرہ موجود ہے (اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ قَالُوا بَلٰی) یقیناً مجھ کو اور میرے ایسے بہت سوں کو وہ عہد و پیمان یاد نہیں ہے میں نہیں کہہ سکتا کہ کسی انسان کو وہ یاد نہیں ہو سکتا۔ ایک خود فراموش کسی بات کو بھول جانے والا یہ حکم لگانے کا کیا حق رکھتا ہے کہ اس کی طرح سب بھول جائیں گے۔ ممکن ہے کہ بڑے قوی نفس اور ادراک والے ایسے انسان ہوں جن کی روح ان مادیات کے شکنجوں میں ظاہری طور پر گرفتار ہو کے بھی اُس عالمِ "الست" کو اور وہاں کے عہد و پیمان کو پوری طرح یاد رکھتی ہو، مگر میں تو اپنے محدود اور کمزور نفس کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ مجھے وہ عہد یاد نہیں پھر بھی معلوم ہونا چاہئے کہ ایک چیز جو کسی وقت یاد کر لی گئی ہو ممکن ہے بعد میں فراموش ہو جائے اور اس کا یاد کیا جانا بھی دماغ میں محفوظ نہ ہو مگر پھر جب وہ سبق پڑھایا جائے گا اور یاد کرنے کی کوشش کی جائے گی تو اس پہلی یاد کا مٹا ہوا نقش اس مرتبہ سہولت کا باعث ضرور ہوگا

اور اُتنی دشواری اس میں نہ ہوگی جتنی بالکل کسی نئے سبق کے یاد کرنے میں ہوتی۔ اس طرح عالمِ "الست" کا ہونا ضرور انسانی نفوس کو اُن کے موجودہ دور میں معرفت و اطاعت کے درجہ سے قریب کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہے ؛

مگر یہ اعتقاد سے متعلق چیز ہے۔ جو شخص اس جسم سے پہلے روح کے وجود ہی کا قائل نہ ہو اور "عالم ذر" کو کوئی چیز نہ سمجھتا ہو، وہ میرے اس بیان کو بالکل غلط اور بے بُنیاد سمجھے گا۔

پھر آیئے آگے بڑھیں اور اُسی دور کا مطالعہ کریں کہ جب یہ انسان مادی حیثیت سے عالمِ وجود میں آتا ہے یعنی دُنیا میں پیدا ہوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ احکامِ شریعت نے اس کی پیدائش کے پہلے ہی سے اس کی آئندہ عملی زندگی کی اصلاح کی طرف توجہ رکھی ہے۔

رابطۂ ازدواج میں مُستقبل کا لحاظ

اولاد کے مفاد کیلئے ماں کا انتخاب

شریعت نے اس انسان کی زندگی کی اصلاح کا اُسوقت سے انتظام کیا ہے۔ جس وقت کہ ابھی اس نے دُنیا میں قدم نہیں رکھا ہے۔ وہ ابھی کسی پردہ میں پوشیدہ بھی نہیں ہے بلکہ اس کا آئندہ بھی موجود ہونا کوئی یقینی امر نہیں، صرف ایک توقع بعید کی حیثیت رکھتا ہے، یہ وہ وقت ہے جب کہ اسکا باپ شادی کرنیکا

ارادہ کرتا ہے۔ اسی وقت اس طرح کے ہدایات ہیں کہ ہر عورت کے ساتھ آنکھیں بند کر کے وہ شادی نہ کرلے بلکہ قوتِ انتخاب سے کام لے ایسی عورتوں سے اور ایسے گھرانوں میں شادی کرے جو عادات و افعال کے لحاظ سے جوہرِ شرافت و انسانیت کے حامل ہوں۔ یہ اسلئے ہے کہ اس عورت سے پیدا ہونے والی اولاد بُرے اوصاف و خصائل کی طرف رجحان نہ رکھتی ہو اور بُرے اثرات کی حامل نہ ہو ؛

یہ امر کسی طرح شک و شبہ کی گنجائش نہیں رکھتا کہ بہت سے اوصاف وراثت کے ذریعہ سے اولاد کی طرف منتقل ہوتے ہیں، وہ لوگ جو جانوروں کی تربیت کا شوق و ذوق رکھتے ہیں اس قسم کے تجربات حاصل کرتے رہتے ہوں گے کہ ایک ادنیٰ قسم کے جانور کا تعلق اعلیٰ قسم کے جانور سے پیدا کر کے کس طرح اُس کی نسل کو رفتہ رفتہ بلند درجہ پہ لایا جاتا ہے ؛

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اوصاف میں وراثت کا قانون جاری ہے۔ پھر اخلاق و عادات، یہ اکثر مزاج طبعی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ بالکل غیر قابل تبدیلی نہ ہوں۔ بلکہ قوت کے ساتھ اُن کا مقابلہ کرنے پر ان میں تبدیلی ہو سکے لیکن پھر بھی طبیعت کا تقاضا کسی خاص طرح کے افعال کے لئے ایک ناقابل انکار حقیقت ہے اور جب کہ مزاج طبعی ماں باپ کا اولاد کی طرف منتقل ہوتا ہے تو خصال و عادات کی یگانگت اسی کا نتیجہ ہو سکتی ہے ؛

اس بناء پر ضرورت ہے کہ باپ اور ماں افعال و کردار کے لحاظ سے بلند

اور پاکیزہ ہوں تاکہ ان کے صفات کا عکس اولاد کے اوپر پڑ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اس معاملہ میں شریعت نے پابندیاں عائد کرنا ضروری خیال کی ہیں۔

دنیا میں شادی بیاہ کے مسئلہ میں مختلف حیثیتوں سے تفریق قائم کی گئی ہے کبھی اونچ ذات اور نیچ ذات دیکھی جاتی ہے۔ یہ بات ہندوستان کے مسلمانوں میں بہت زیادہ پیدا ہوگئی ہے، ادھر کسی کا ذکر ہوا۔ کہا گیا وہ تو کم ہے۔ اس کی ذات خراب ہے۔ وہ برابر والا نہیں ہے۔ اس تفریق کو مذہب اسلام نے بالکل ناقابل اعتبار قرار دیا ہے؛

یہ یہود و نصاریٰ کی ذہنیت تھی کہ وہ بنی اسمٰعیلؑ کو جن میں سے رسول اللہ صلعم تھے اپنے سے کم درجہ پر سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہم بیوی کی اولاد ہیں اور یہ لونڈی کی نسل سے ہیں۔ ان کو ہمارے مقابلہ کا حق نہیں، مگر شریعتِ اسلام نے یہ عام اعلان کیا کہ نسلی تفریق کوئی چیز نہیں ہے: اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا۔ (یہ تو فقط شناخت کے لئے خاندانوں کی تفریق قرار دی گئی ہے اس سے عزت میں کوئی فرق نہیں آتا) اور حضرت رسول اللہ صلعم نے صاف اظہار کر دیا کہ لَا فَخْرَ لِلْقُرَشِيِّ عَلٰى غَيْرِ الْقُرَشِيِّ وَلَا لِلْعَرَبِيِّ عَلٰى غَيْرِ الْعَرَبِيِّ "کوئی فخر نہیں قرشی کو غیر قرشی پر اور عربی کو غیر عربی پر"

قرآن میں ہے خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ تم سب ایک ہی ہو۔ پھر تفریق کیسی؟ خود رسول اللہ صلعم نے اپنی بہت قریب کی عزیزہ زینب بنت حجش

کا عقد زید بن حارث رضؓ کے ساتھ کر دیا جو بظاہر غلام کی حیثیت رکھتے تھے اور ضبیعہ بنت الحارث رضؓ کا عقد مقدادؓ کے ساتھ کر دیا۔

اسی طرح مال و دولت کے اعتبار سے تفرقہ جو عام طور سے قابلِ لحاظ سمجھا جاتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ لڑکی والے اس امر کا لحاظ کریں تو پھر بھی صحیح ہے۔ اس لئے کہ اس لڑکی کی زندگی، اس کا نان ونفقہ سب مرد کے ساتھ وابستہ ہے۔ لیکن آجکل تو لڑکے والے اس امر کو دریافت کرتے ہیں کہ لڑکی صاحبِ جائداد ہے یا نہیں اور وہ کتنے دولتمند گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ بہت افسوسناک ذہنیت ہے۔ بعض افراد حسن وجمال کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ اب موجودہ زمانہ میں اخباروں میں شادیوں کے لئے جو اعلانات ہوتے ہیں ان میں اکثر خوبصورتی کا تذکرہ موجود ہوتا ہے۔ شرعی تعلیمات میں ان دونوں باتوں کے لحاظ کو بے جا قرار دیا گیا ہے اور یہ بتلایا گیا ہے کہ جو مال وجمال کو صرف اپنا مقصد قرار دے گا وہ ان دونوں باتوں سے محروم ہوگا۔

وہاں کس اعتبار سے تفریق قرار دی گئی ہے؟ عقائد و اعمال کے لحاظ سے کافر اور مسلم کفو نہیں ہیں ان کی شادی بالکل ناجائز۔ کیونکہ عقائد و اعمال کا اثر اولاد پر پڑنا ضروری ہے۔ اسی طرح بد سیرت اور غیر شریفانہ افعال کی مرتکب عورتوں کے ساتھ شادی کی ممانعت؛

قرآن مجید میں یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ "اَلزَّانِيْ لَا يَنْكِحُ اِلَّا زَانِيَةً"

أَوْ مُشْرِكَةً وَالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَا إِلَّا زَانٍ أَوْ مُشْرِكٌ اس کا یہ مقصد ہے کہ بُرے افعال کے جراثیم اپنے مرکز سے متعدی ہو کر کسی صاف فضا کو بھی مکدر نہ بنا دیں۔

"ماں کا انتخاب" اولاد کے مفاد کی خاطر ہے اس کے لئے ملاحظہ ہوں، ذیل کے احادیث:۔ امام جعفر صادقؑ کی روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا اِخْتَارُوا لِنُطَفِكُمْ فَإِنَّ الْخَالَ أَحَدُ الضَّجِيعَيْنِ یعنی اپنے نطفوں کے لئے محل کی تلاش میں انتخاب سے کام لو کیونکہ ننھیال کا بچہ پر برا اثر پڑتا ہے۔

ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔
اَلشَّجَاعَةُ فِي أَهْلِ خُرَاسَانَ وَالسَّخَاءُ وَالْحَسَدُ فِي الْعَرَبِ فَتَخَيَّرُوا نُطَفَكُمْ "خراسان کے لوگوں میں شجاعت کی صفت ہے اور عربوں میں سخاوت ہے اور رشک، لہٰذا اپنے نطفوں کیلئے سمجھ بوجھ کر انتخاب کرو"

اس امر میں سب سے زیادہ لحاظ سیرت اور خصائل وعادات ہی کا ہے۔ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں اِنَّمَا الْمَرْأَةُ قِلَادَةٌ فَانْظُرْ إِلَى مَا تُقَلِّدُهُ "عورت گلے کا ہار ہے، ذرا غور کر لو کہ تم کیسی عورت کو گلے کا ہار بنا رہے ہو" ارشاد ہوتا ہے لَيْسَ لِلْمَرْأَةِ خَطَرٌ لَا لِصَالِحَتِهِنَّ وَلَا لِطَالِحَتِهِنَّ فَلَيْسَ خَطَرُهَا الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ بَلْ هِيَ خَيْرٌ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَأَمَّا طَالِحَتُهُنَّ فَلَيْسَ التُّرَابُ خَطَرَهَا بَلِ التُّرَابُ خَيْرٌ مِنْهَا۔

عورت کی کوئی قیمت نہیں یعنی کوئی شے نہیں جو اس کے مساوی ہو سکے۔ نہ نیکو کار عورت کے لئے اور نہ بدکار کے لئے

اگر نیکوکار عورت ہے تو سونا چاندی بھی اس کے مقابل نہیں آسکتے بلکہ وہ سونے اور چاندی سے بہتر ہے اور اگر بدکار ہے تو مٹی بھی اس کے مقابل نہیں کیونکہ مٹی بھی اس سے بہتر ہے"

صورت کا حسن وجمال سیرت کی خرابی کے ساتھ کوئی چیز نہیں اس کو ان الفاظ میں ادا فرمایا ہے۔ کہ:۔ أَيُّهَا النَّاسُ إِيَّاكُمْ وَخَضْرَاءَ الدِّمَنِ۔ "خبردار ان باغوں سے بچتے رہو جو گھوڑے پر اُگے ہوئے ہوں" پوچھا گیا کہ اس کا مطلب؟ فرمایا اَلْمَرْأَةُ الْحَسْنَاءُ فِي مَنْبَتِ السُّوْءِ

"خوبصورت عورت برے سیرت وکردار کے ساتھ"

یہ ہے شریعت کی وہ پیش بندی جو نسل انسانی کے آراستہ بنانے کے لئے پہلے سے کی گئی ہے:

آدابِ نکاح میں انسانی ذہنیت کی تشکیل

شادی بیاہ عام طور پر انسانی نفس کے تقاضا کا نتیجہ ہے۔ مگر یہ اسلام کی حکیمانہ روش ہے کہ اس نے شادی کے مسئلہ میں اس قدر حدود وقیود اور آداب وقواعد عائد کر دیے ہیں۔ جن کے بعد وہ ایک فرض اور شرعی رسم کی صورت سے عمل میں آتا ہے۔ اس میں بڑا رمز یہ ہے کہ جو چیز صرف جذبات کے تحت میں عمل میں لائی جائے، اس کے نتائج کی اصلاح پر انسان کو توجہ

کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں محسوس ہوتی اور اس کا صرف خواہش نفس کی بنا پر عمل میں آنا خود ہی اس کے مطلق العنان ہو جانے کا محرّک ہے۔ مگر جبکہ وہ امر فرض و قانون کی بنا پر عمل میں آئے گا تو انسان کو اس کے نتائج کی طرف توجہ بھی پیدا ہوگی اور انکی اصلاح کی فکر ہوگی ؛

شادی کے وقت سے اولاد کے مفاد کو کس حد تک پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اس کو آپ ان دعاؤں سے سمجھ سکتے ہیں جن کے پڑھنے کی اس موقع پر ہدایت ہوئی ہے۔ یہ دعائیں جو استحبابی طور پر وارد ہوئی ہیں۔ ظاہر میں بالکل معمولی چیز سمجھی جاتی ہیں مگر ان دعاؤں ہی میں وہ روح مضمر ہوتی ہے جو کسی عمل کی اصل بنیاد ہے یا ان میں اس مفاد و منشاء کی جانب اشارہ ہوتا ہے جو اس عمل میں مضمر ہے۔ ان سے انسانی دماغ میں وہ خیالات راسخ کیے جاتے ہیں۔ جن کا پیش نظر رکھا جانا شارع کو مدِ نظر ہے ؛

اب دیکھیے امام جعفر صادقؑ نے ابوبصیر کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا۔ اِذَا تَزَوَّجَ اَحَدُکُمْ کَیْفَ یَصْنَعُ "جب تم میں سے کسی کی شادی ہوتی ہے تو اسے کیا کرنا چاہیے؟" ابوبصیر نے عرض کیا مَا اَدْرِیْ جُعِلْتُ فِدَاکَ "مجھے نہیں معلوم فدایت شوم" حضرت نے فرمایا جب شادی کا ارادہ ہو تو دو رکعت نماز پڑھے اور حمد خدا بجا لائے اور کہے اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اُرِیْدُ اَنْ اَتَزَوَّجَ اَللّٰھُمَّ فَاقْدِرْ لِیْ مِنَ النِّسَآءِ اَعَفَّھُنَّ فَرْجًا وَ اَحْفَظَھُنَّ لِیْ فِیْ نَفْسِھَا

وَ فِیْ مَالِیْ وَ اَوْسَعَھُنَّ رِزْقًا وَ اَعْظَمَھُنَّ بَرَکَۃً وَ اقْدِرْ لِیْ مِنْھَا وَلَدًا طَیِّبًا تَجْعَلُہٗ خَلَفًا صَالِحًا فِیْ حَیَاتِیْ وَ بَعْدَ مَوْتِیْ۔

(یعنی) "خداوندا میں چاہتا ہوں کہ شادی کروں۔ بار الٰہا تو مقرر کر میرے لیے عورتوں میں سے وہ جو سب سے زیادہ پارسا ہو اور اپنی ذات اور میرے مال و دولت کے بارے میں میری امانت کی حفاظت کرنے والی ہو اور اچھی قسمت والی اور مبارک ہو اور مقرر کر میرے واسطے اس سے ایک پاکیزہ فرزند جو صالح اور نیک عمل ہو اور میرا جانشین ہو میری زندگی میں بھی اور میرے مرنے کے بعد"

پھر جب شادی ہو جائے اور عورت کو بیاہ کر گھر میں لائے تو اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھے اور یہ دعا پڑھے۔ اَللّٰھُمَّ عَلٰی کِتَابِکَ تَزَوَّجْتُھَا وَ فِیْ اَمَانَتِکَ اَخَذْتُھَا وَ بِکَلِمَاتِکَ اسْتَحْلَلْتُ فَرْجَھَا فَاِنْ قَضَیْتَ فِیْ رَحِمِھَا شَیْئًا فَاجْعَلْہُ مُسْلِمًا سَوِیًّا وَ لَا تَجْعَلْہُ شِرْکَ شَیْطَانٍ۔

(یعنی) خداوندا تیری کتاب کے مطابق میں نے اس سے شادی کی ہے اور تیری ذمہ داری پر میں نے اس کو لیا ہے۔ اور تیرے مقرر کردہ الفاظ کے ذریعہ سے میں نے اس کو اپنے لئے جائز بنایا ہے۔ اب اگر تو نے اس کے بطن سے کوئی اولاد میرے مقدر میں قرار دی ہے تو اسکو بالکل صحیح مسلمان بنانا اور اس میں شیطان کو شرکت کا موقع نہ دینا"

"سویّا" کی لفظ کے معنی ہیں "تام و کامل" اس کا جیسا موصوف آئے تمامیت

وکمال اس لحاظ سے معتبر ہوگا "ذکراسویّا" اس کے معنی ہوں گے تام الخلقت لڑکا اور یہاں چونکہ مسلماً سویّا ہے۔ اس لیے معنی یہ ہوں گے کہ "پورا مسلمان" جس سے اشارہ اعتقاد و عمل دونوں کے صحت و کمال کی طرف ہوگا پھر کہا گیا کہ اس میں شیطان کی شرکت نہ ہو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ شیطانی راستوں کا سالک نہ ہو، یعنی برائیوں کا ارتکاب کرنے والا نہ ہو جن کی تحریک شیطانی طاقتوں کا نتیجہ ہے۔

ان دعاؤں کے پڑھنے سے انسانی ذہنیت کی تشکیل ہوتی ہے اور یہ مقصد دل نشین ہوتا ہے کہ آئندہ ہونے والی اولاد کو کس طرح کا ہونا چاہیئے۔

وقت ولادت کے احکام

اب وہ وقت آیا کہ جب بچہ کی ولادت ہوئی - اس وقت شریعت کی ہدایت ہے کہ داہنے کان میں اذان کہی جائے اور بائیں کان میں اقامت، اس کے معنی یہ ہیں کہ سب سے پہلے اس کو پیغام پہنچایا جائے۔ وحدانیت خدا، رسالت اور فرائض کی بجا آوری کا۔ ممکن ہے ہم کہیں کہ اس سے فائدہ کیا۔ جبکہ وہ ہم کو یاد نہیں رہتا اس کے متعلق میں عالم ذر کی بحث میں کہہ چکا ہوں کہ ہمیں یاد نہیں تو یہ ضروری نہیں کہ کسی کو بھی یاد نہ رہے پھر بچپنے کے واقعات کی یادداشت کے درجے تو مشاہدہ و تجربہ کے لحاظ سے بھی مختلف ہیں۔ یعنی بہت سے

لوگوں کو تین چار برس کی باتیں یاد رہتی ہیں اور بعض کو اس سے کم سنی کی بھی جبکہ اس کا کوئی عقلی معیار نہیں اور اختلاف درجات اس میں محسوس طریقہ سے ظاہر ہے تو ہمیں یہ سمجھنے کا کیا حق ہے کہ کسی کو اپنی پیدائش کے بعد کی باتیں یاد نہیں رہ سکتیں۔

پھر اسے یوں کیوں نہ سمجھ لیجئے کہ جیسے اہل دنیا نے اپنے مذاق کے مطابق شگون مقرر کئے ہیں - جن سے ان کی آرزو کا اظہار ہوتا ہے کہ مستقبل کے حالات اس طرح ہوں۔ شریعت نے ان کی ذہنیت کو بدلنے کے لئے اپنی جانب سے یہ ایک شگون مقرر کیا ہے جس سے آرزو کا انسانی ذہن میں پیدا کرنا مقصود ہے کہ یہ بچہ آگے بڑھ کر اس راستے پر قائم رہے گا۔ اور ان فرائض کی پابندی کرے گا۔

رضاعت کا انتظام

بچہ کی غذا قدرت نے دودھ مقرر کی ہے۔ اس کے لئے اکثر ضرورت پڑتی ہے کہ اناؤں کے ذریعہ سے دودھ پلوایا جائے اور کبھی بلاضرورت بھی رئیس خاندانوں کی عورتیں خود اس امر سے احتراز کرتی ہیں اور انّا ملازم رکھتی ہیں اس امر میں شریعت کی جانب سے پہلے تو یہ تاکید ہے کہ ماں خود رضاعت کرے اور انّا مقرر ہی نہ کی جائے۔ چنانچہ امیرالمومنین ارشاد فرماتے ہیں مَا مِنْ لَبَنٍ یُرْضَعُ بِهِ الصَّبِیُّ اَعْظَمُ بَرَكَةً عَلَيْهِ مِنْ لَبَنِ اُمِّهِ "کوئی دودھ جس سے بچہ کی رضاعت

اس کے لیئے ماں کے دودھ سے زیادہ مبارک نہیں ہے"

اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے کہ غذا جس قدر مناسب مزاج ہوگی اسی قدر اس کا فائدہ زیادہ ظاہر ہوگا اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ بچہ جو مثل اپنی ماں کے جزو ہے اس کے لیئے خود اسی ماں کے دودھ سے زیادہ کوئی چیز مناسب مزاج نہیں ہو سکتی۔

لیکن اگر ضرورت ہو انّا مقرر کرنے کی یا بلا ضرورت بھی ماں اپنے فرض کو انجام نہ دے اور انّا مقرر کرے تو تاکید ہے کہ انّا کے بارے میں انتخاب سے کام لیا جائے۔ ہر ایک کا دودھ اس بچہ کو نہ دیا جائے اس لئے کہ اس کا اثر اس بچہ کے اوصاف و افعال پر پڑے گا اور وہی خو بو اس میں قائم رہے گی۔

چنانچہ تاکید ہے کہ یہودیہ، نصرانیہ اور مجوسیہ سے دودھ نہ پلوایا جائے۔ اگر اتفاق سے یہ امر ناگزیر ہو تو بچہ کو اسے نہ دیا جائے کہ وہ اپنے گھر لے جائے بلکہ اس کو بلا کر اپنے یہاں رکھا جائے اور خمر و خنزیر کے استعمال سے اس کو روک دیا جائے۔ مقصود یہ ہے کہ اگر وہ ان چیزوں کا استعمال کرے گی تو ان سے خود اس کا خون تیار ہوگا اور وہ دودھ کی شکل میں آئے گا اور وہ اس بچہ کے جسم میں جا کر اس کے خون کی صورت اختیار کرے گا۔ شریعت کو کسی صورت سے بھی یہ منظور نہیں کہ مسلمان کے جسم میں ان چیزوں کی شرکت ہو۔

ناصبی عورت سے بھی رضاعت کی ممانعت ہے۔ وہ وہ ہے جو عداوت اہلبیتؑ کا

اظہار کرتی ہو۔ اس کے علاوہ اس کے دوسرے اوصاف کا بھی لحاظ کرنا ضروری ہے تاکہ بچہ کے اوصاف پر کوئی برا اثر نہ پڑے۔

امیر المومنینؑ فرماتے ہیں اُنْظُرُوا مَنْ يُرْضِعُ أَوْلَادَكُمْ فَإِنَّ الْوَلَدَ يَشِبُّ عَلَيْهِ "ذرا دیکھ بھال لو کہ تمہاری اولاد کی رضاعت کس طرح کی عورت کر رہی ہے۔ اس لئے کہ ان ہی آثار پر جو دودھ سے پیدا ہوں لڑکا جوان ہوگا"

امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں لَا تَسْتَرْضِعُوا الْحَمْقَاءَ فَإِنَّ اللَّبَنَ يُعْدِي وَإِنَّ الْغُلَامَ يَنْزِعُ إِلَى اللَّبَنِ "کم عقل عورت سے دودھ نہ پلواؤ۔ اس لئے کہ دودھ تعدی کا باعث ہوتا ہے اور بچہ دودھ کے خواص کی طرف کھنچ جاتا ہے"

امیر المومنینؑ کا ارشاد ہے تَخَيَّرُوا لِلرِّضَاعِ كَمَا تَتَخَيَّرُونَ لِلنِّكَاحِ فَإِنَّ الرِّضَاعَ يُغَيِّرُ الطِّبَاعَ "رضاعت کیلئے اسی طرح انتخاب سے کام لو جیسے شادی کے لئے انتخاب کرتے ہو۔ اس لئے کہ رضاعت کا اثر طبعی خواص پر غالب آ جاتا ہے اور طبیعت میں تبدیلی کر دیتا ہے"

دودھ بڑھائی کے بعد

جب دو برس بچہ کی عمر کے پورے ہو جائیں تو یہ شرعاً دودھ پینے کی آخری مدت ہے۔ خود قرآنِ مجید میں مذکور ہے: وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ۔ اس آیت سے وہ امر بھی ظاہر ہے، جس پر میں نے پہلے

تبصرہ کیا تھا کہ مطلوب اوّلین شرع ابھی ہے کہ خود ماں اپنے بچہ کو دودھ پلائے، کیونکہ ارشاد ہوتا ہے کہ "مائیں اپنی اولاد کو دودھ پلائیں پورے دو برس" اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر دو برس کے بعد کوئی عورت بچہ کو دودھ پلائے تو وہ احکام جو شرعاً رضاع کیلئے مقرر ہیں مترتب نہ ہونگے، نہ وہ اس کی ماں قرار پائے گی۔ نہ اسکی اولاد اس کی بھائی بہن وغیرہ۔ اس حکم میں کوئی خصوصیت لڑکے لڑکی کی نہیں ہے۔" اولاد کی لفظ دونوں کو عام ہے ؛

اب اس کے بعد چار، پانچ برس بچہ کو کھیل کود لینے دینا چاہئے یہ زمانہ تعلیم و تربیت اخلاق کا نہیں ہے اس لیے کہ ابھی وہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکتا بے شک اس دوران میں بھی ایک حد تک نگرانی ضروری ہے ان چیزوں کے متعلق جن کی اہمیت بہت زیادہ ہے مثلاً شراب وغیرہ کا استعمال نہ ہونے دے۔ نیز کسی دوسرے کی نقصان رسانی کا باعث نہ ہو۔ مگر یہ چیز تربیت و تعلیم کی حیثیت سے نہیں ہے بلکہ یہ ویسا ہے، جیسے جانور اپنا ہو تو اس کے ذریعہ سے کسی کو نقصان پہنچنے نہ دینا چاہئے اور شراب وغیرہ سے روکنا اس طرح جیسے زہر، سنکھیا کے استعمال سے اس بچہ کو روکنا تاکہ اس میں مضر جراثیم اور مہلک سمیت پیدا نہ ہو جائے۔ یہ ایک باپ یا سرپرست کا ذاتی فرض ہے۔ بچہ کی تعلیم سے اس کو تعلق نہیں ہے ؛

تربیّت کا زمانہ

اور

ماں باپ کی ذمّہ داریاں

جس وقت سے کہ بچہ سات یا چھ برس کا ہو، اب اس کی تعلیم و تربیت کی ضرورت ہے۔

یہ بالکل غلط خیال ہے کہ ایک انسان صرف اپنے اعمال کا جواب دہ ہے بلکہ اپنی اولاد کی اصلاح و تربیت اس کا اہم فرض ہے۔

بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ وہ خود اپنی ذات سے بہت اچھے ہیں۔ پابند صوم و صلوٰۃ ہیں اور تمام احکام شرعیہ پر عامل ہیں۔ مگر اپنی اولاد کی طرف انہوں نے کوئی توجہ نہیں کی ہے ؛

ایسے لوگ یقیناً پیش خدا جواب دہ ہیں۔ بلکہ مجھے خود اُن کے حسن عمل میں تامّل ہے۔ کیونکہ ان کی ظاہری پابندی شرع احکام شرع کی اہمیت کے احساس کی بناء پر نہیں ہے اگر انہیں فرائض شرعیہ کی اہمیت کا صحیح احساس ہوتا، تو کبھی وہ اپنی اولاد کو اس طرح مطلق العنان نہ چھوڑ دیتے جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ انہیں بچہ کی معمولی معمولی باتوں کا جو اس زندگی سے متعلق ہیں خیال ہے، کسی وقت دوپہر کو گرمی میں اور لو کی شدت میں بچہ باہر نکلنا چاہتا ہے، ماں باپ ڈانٹ دیں گے، روکیں

گے اور زبردستی سے کام لیں گے کہ وہ باہر نہ جائے۔ کس لئے!
اس واسطے کہ لُو کی گرمی اس کو تکلیف نہ پہنچائے۔ پھر اس لُو
کی گرمی کا اتنا خیال۔ مگر آخرت کے عذاب کی کوئی پرواہ نہیں
آتش جہنم کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کا کوئی خیال نہیں وہ آزادی
کے ساتھ اپنی اولاد کو ایسے راستوں پر چلنے دیتے ہیں، جو انہیں
غضب خداوندی کا مستحق بنائیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں صحیح
احساس روزِ قیامت کے حساب اور احکامِ خدا کی اطاعت کا نہیں
ہے۔ پھر یہ خود جو شرع کے پابند نظر آتے ہیں اس کو صرف
ان کے والدین کے احساسِ فرض کا نتیجہ سمجھئے کہ انہوں نے
ان کو عادی بنا دیا ہے ان احکام کے بجا لانے کا۔ اس لئے یہ
اس کی پابندی کرتے ہیں۔ ورنہ خود ان کے دماغ میں کوئی
خاص اہمیت ان احکام کی موجود نہیں ہے۔

اس سے زیادہ قابلِ اعتراض ہے اُن اشخاص کا طرزِ عمل جو اپنے
افعال و اعمال سے اپنے بچوں کے لئے غلط مثال قائم کرتے ہیں
اور برائیوں کے لئے ان کی ہمت افزائی کا باعث ہوتے ہیں۔ میں
سچ کہتا ہوں کہ ان کے لئے تنہائی میں کسی جُرم کا ارتکاب کر لینا اتنا بُرا
نہیں ہے جتنا اپنی اولاد کے علم و اطلاع میں اس قسم کے افعال کا مرتکب
ہونا اگر جوانی کے دور میں کسی سے بے راہ روی ہوئی ہو تو خیر اس پر
خدا سے مغفرت کا متوقع رہے۔ مگر اب اولاد کی موجودگی

میں بہت زیادہ اسے اپنے نفس کی نگرانی کی ضرورت ہے۔ یاد رہے کہ اگر
اولاد کی تباہی اس کے ہاتھوں ہوئی اور اسکی نسل خود اس کے سبب سے
گمراہی میں مبتلا ہوئی تو وہ خود دنیا سے اٹھ جائے گا، جب بھی اس کے
نامہ عمل میں گناہوں کا سلسلہ قائم رہے گا۔ کیونکہ وہ ذمہ دار ہے
ان تمام خراب نتائج کا جو اس کے بعد رونما ہو رہے ہیں۔

اب ملاحظہ کیجئے کہ تربیت اولاد کے لئے شرع نے کس طرح
انتظام کیا ہے؟

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ وَابْنُكَ يَلْعَبُ سَبْعَ سِنِيْنَ وَالزِمْهُ
نَفْسَكَ سَبْعَ سِنِيْنَ "سات برس تک بچہ کو کھیلنے دو، اور پھر
سات برس اسے بالکل اپنا پابند بنائے رکھو، یعنی اس کے افعال
و اعمال کی سختی کے ساتھ نگرانی کرو" دوسری حدیث میں ہے:۔
اَمْهِلْ صَبِيَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَ لَهُ سِتُّ سِنِيْنَ ثُمَّ ضُمَّهُ اِلَيْكَ سَبْعَ
سِنِيْنَ "اپنے بچہ کو مہلت دو۔ یہاں تک کہ اس کی چھ برس کی عمر ہو۔
پھر سات برس تک اسے بالکل اپنے ساتھ رکھو" یہ مدت کا اختلاف
اس بنا پر ہے کہ حقیقۃً اس کے لئے کوئی تعبدی حیثیت سے عمر نہیں
مقرر کی گئی ہے بلکہ غالبی حیثیت سے عمر کا ایک تخمینہ تبلایا گیا ہے
مطلب یہ ہے کہ جب بچہ کچھ سمجھدار ہو جائے اور تعلیم و تربیت کا اس
پر اثر پڑ سکے۔ یہ بات بعض بچوں میں پانچ یا چھ برس ہی میں حاصل ہو
جائے گی اور بعض کے یہاں سات برس یا اس سے زیادہ میں۔

ابتدائی تعلیم

اس مدت میں ایک طرف تو بچہ کے اخلاق و افعال کو درست کرنا چاہئے، دوسری طرف اس کو احکام شرعیہ اور فرائض سے واقف بنانا چاہئے۔ اس لئے کہ اس کے بعد عنقریب وہ وقت آجائے گا جب اس پر حکم تکلیف جاری ہو جائے اور وہ فرائض کی ذمہ داری میں گرفتار ہو جائے اس کے لئے اسے پہلے سے تیار ہونے کی ضرورت ہے۔

لیکن اس کے ساتھ شریعت نے ضروریاتِ دنیا کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ امیر المومنینؑ کی روایت ہے کہ رسالتمآبؐ نے فرمایا عَلِّمُوْا اَوْلَادَکُمُ السِّبَاحَۃَ وَالرِّمَایَۃَ "اپنی اولاد کو پیرا کی اور تیر اندازی کی تعلیم دو۔"

یہ وہ چیزیں جو دنیاوی زندگی کی حفاظت کا ذریعہ ہیں۔ یہاں ان دونوں چیزوں کا تذکرہ بطور مثال ہے۔ "تیر اندازی" کے بجائے اگر کسی وقت میں کوئی دوسری صورت اس کی قائم ہو جائے تو اس کی تعلیم کی ہدایت ہو گی۔ اسی طرح پیرنے کی طرح اگر کشتی کا رواج ہو جائے تو کشتی رانی بھی اس میں داخل ہو سکتی ہے۔ یہ چیزیں حیات دنیا کے لئے ہیں اور اسلام دنیاوی زندگی کی تقویت کا حامی ہے۔ یہ غلط ذہنیت ہے کہ ان تمام چیزوں کو عیب سمجھ لیا گیا ہے۔ یا ورع و تقویٰ کے منافی قرار دے لیا گیا ہے۔

بچہ جب اس سات برس میں اخلاق و عادات حسنہ کا پابند ہو گیا اور ایسی تعلیم بھی اس کو دے دی گئی جو اس کے معاش و معاد دونوں کی اصلاح کے لئے ضروری ہے تو اب وہ وقت ہے کہ عملی طور پر اس کو مشکلات دنیا کا حل کرنا سکھلایا جائے۔ اب باپ اس کو بحیثیت ایک معین زندگی اور مددگار کے اپنے مستحسن کاموں میں اور مشکلات کے حل کرنے میں شریک کرے اور اس کے قوائے عمل کی تکمیل کرے۔

اس کو امیر المومنینؑ ان الفاظ میں فرماتے ہیں کہ:۔ یُرَقَّدُ الصَّبِیُّ سَبْعًا وَیُؤَدَّبُ سَبْعًا وَیُسْتَخْدَمُ سَبْعًا "سات برس تک بچہ کو آرام دینا چاہئے پھر سات برس تک اس کے اخلاق و عادات کی اصلاح کرنا چاہئے، پھر سات برس تک اس سے کام لینا چاہئے"

اس کو رسالتمآبؐ نے بہت زیادہ بلیغ الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے:۔ قَالَ النَّبِیُّ اَلْوَلَدُ سَیِّدٌ سَبْعَ سِنِیْنَ وَعَبْدٌ سَبْعَ سِنِیْنَ وَوَزِیْرٌ سَبْعَ سِنِیْنَ "بچہ سات برس تک بادشاہ ہے یعنی جو چاہے کرے، کوئی روک ٹوک نہیں پھر سات برس غلام ہے۔ اس لئے کہ ابھی اس میں عقل و شعور اتنا نہیں کہ وہ اچھائی برائی سمجھ سکے مگر بادلِ ناخواستہ صرف باپ کے دباؤ سے وہ اس کے بتلائے ہوئے افعال کو کرے گا۔ یہ اس طرح کی جبری اطاعت ہے، جیسے غلام اپنے آقا کی کرتے ہیں۔ پھر اس کے بعد سات برس یعنی پندرہ سے اکیس تک وہ وزیر ہے۔ یعنی اس میں اب خود عقل آگئی ہے۔ اب وہ خود سمجھ کر باپ کا دست و بازو بنکر

زندگی کی منزلوں کو طے کریگا۔ یہ وہ شان ہے جو ایک وزیر کی بادشاہ
کے لئے ہوتی ہے۔

غلط تربیت کے افسوسناک نتائج

مُضر جراثیم سے حفاظت کی ضرورت

بچوں کو ابتدائی زندگی سے مہلک جراثیم سے محفوظ رکھنا انتہائی اہم فرض
ہے۔ موجودہ زمانہ میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ ادھر بچہ ذرا سن شعور کو پہنچا
اور اسے بغیر دینیات کی تعلیم دلائے ہوئے اسکول یا کالج میں بھیجدیا
وہاں کے معلمین جو اپنے دماغوں میں مذہب کے خلاف خیالات لیئے
ہوئے ہوتے ہیں بچوں پر شروع ہی سے اپنا اثر ڈالتے ہیں ممکن ہے کہ آئینی قواعد کی بنا پر وہ کھُلم کھُلا
اپنے خیالات کی تبلیغ کا مدرسہ کے اندر حق نہ پائیں مگر انکے قلبی جذبات اور دماغی خیالات کا اثر ان
کے اقوال و افعال میں پیدا ہو جانا ضروری ہے۔ کسی مذہبی حکم کے سننے پر خندۂ زیر
لب کسی مذہبی اعتقاد کے تذکرہ میں یہ الفاظ کہ "لوگ ایسا خیال کرتے
ہیں"، یہ وہ معمولی باتیں ہیں۔ جو نہ معلوم کتنے طلاب کے ذہن
کو متاثر بنا دیتی ہیں۔ پھر طالب علم اپنے ابتدائی دور میں
تقریباً اپنے معلّمین کو معصوم سمجھتا ہے۔ وہ اُن کی ہر بات
کو سر آنکھوں پر رکھنے کے لیئے آمادہ ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا
ہے کہ اس کے دماغ میں مذہب کے خلاف خیالات راسخ ہو
جاتے ہیں اور وہ سمجھتا ہے کہ یہ تمام معتقدات و روایات خرافات

واوہام کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ اب اگر آپ اس کی مذہبی اصلاح
کرنا بھی چاہیں تو نہیں ہوگی۔ اس لیئے کہ وہ سننے پر آمادہ ہی
نہ ہوگا اور سُنے گا تو اس خیال کو لے کر کہ یہ بالکل مہمل
باتیں ہیں۔ اس لیئے اس پر اثر نہیں ہوگا۔ یاد رکھنا چاہیئے
کہ انگریزی تعلیم پورا سبب گمراہی کا نہیں ہے۔ بلکہ یہ غلط
طرز عمل گمراہی کا سبب ہے۔

اگر مذہب کی بنیادیں مضبوط ہو گئی ہوتیں تو بڑے بڑے
شبہات و اعتراضات کہ وہ برداشت کر لیتیں مگر یہاں نیو مذہب
کی بالکل مستحکم نہیں ہے۔ اس لیئے کہ یا تو مذہبی معلومات ہیں
ہی نہیں یا ہیں تو صرف تقلیدی حیثیت سے اس لیئے معمولی
سا اعتراض و ایراد جو کسی حلقہ سے گوش زد ہو جاتا ہے۔ اس
کے اعتقاد کو متزلزل کر دیتا ہے۔

معصومینؑ کے کلمات میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔
اگرچہ اس زمانہ میں مغربی تعلیم نہیں تھی۔ انگریزی مدارس موجود
نہیں تھے۔ مگر دوسرے گمراہ کن حلقے ایسے تھے جن کے لحاظ سے
یہ تاکید کی گئی ہے کہ تم اپنے تعلیمات بچوں کے ذہن میں راسخ
کردو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دوسرے اثرات ان پر پہلے پڑ جائیں پھر
ان میں قبول حق کی صلاحیت نہ باقی رہے۔

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں: بَادِرُوا اَحْدَاثَکُمْ بِالْحَدِیْثِ قَبْلَ اَنْ

يَسْبقكُمْ اِلَيْهِمُ الْمُرْجِئَةُ" اپنے بچوں کو اپنے روایات و معتقدات کی تعلیم دینے میں جلدی کرو۔ قبل اس کے کہ مرجئہ فرقہ کے تعلیمات ان کی طرف سبقت کریں"

جناب امیرؑ کا ارشاد ہے:۔ عَلِّمُوْا صِبْيَانَكُمْ مِنْ عِلْمِنَا مَا يَنْفَعُهُمُ اللّٰهُ بِهٖ لَا تَغْلِبُ عَلَيْهِمُ الْمُرْجِئَةُ بِرَأْيِهَا " اپنے بچوں کو تعلیم دو ہمارے علم سے وہ جس سے انکو فائدہ پہنچے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مرجئہ کے خیالات ان پر غالب ہو جائیں"

امیر المومنینؑ نے اپنے فرزند امام حسنؑ کیلئے جو وصیت نامہ تحریر فرمایا ہے جو تمام زندگی کے شعبوں کیلئے ہدایات کا ایک مکمل مجموعہ ہے اس کی تمہید میں حضرت نے ہمیں ایک دائمی درس دیتے ہوئے یہ ارشاد کیا ہے جس سے ظاہر میں مخاطب امام حسنؑ ہیں مگر حقیقۃً اس میں ایک عمومی تعلیم مدِ نظر ہے۔ فرماتے ہیں فَبَادَرْتُكَ بِوَصِيَّتِي لِخِصَالٍ" میں نے تمہیں اس وصیت کے پہنچانے میں جلدی سے کام لیا۔ چند وجہوں سے مِنْهَا اَنْ يَعْجَلَ بِيْ اَجَلِيْ" پہلے تو یہ کہ کہیں میری زندگی کی مدت نہ ختم ہو جائے" موت کا کوئی ٹھیک نہیں ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں۔ وَاَنْ يَسْبِقَنِيْ اِلَيْكَ بَعْضُ غَلَبَاتِ الْهَوٰى وَفِتَنِ الدُّنْيَا فَتَكُوْنَ كَالصَّعْبِ النَّفُوْرِ وَاِنَّمَا قَلْبُ الْحَدَثِ كَالْاَرْضِ الْخَالِيَةِ مَا اُلْقِيَ فِيْهَا مِنْ شَيْءٍ قَبِلَتْهُ فَبَادَرْتُكَ بِالْاَدَبِ قَبْلَ اَنْ يَقْسُوَ قَلْبُكَ وَيَشْتَغِلَ لُبُّكَ" اور یہ کہ کہیں تم پر پہلے ہی کچھ غلط خیالات اور ذیل کے ہنگامی اثرات کا غلبہ نہ ہو جائے جس سے تم ایک سخت اور بھڑ کنے والے مرکب کی طرح

بن جاؤ۔ کمسن بچہ کا دل مثل خالی زمین کے ہے کہ جو چیز اس میں بوئی جائے اس کو وہ قبول کر لیتا ہے۔ لہذا میں نے چاہا کہ تمہیں تعلیم دے دوں۔ قبل اس کے کہ تمہارا دل سخت ہو اور تمہاری عقل دوسری چیزوں سے متاثر ہو۔

بے شک ایسے باپ، چچا یا دوسرے بزرگ انتہائی درجہ موردِ اعتراض ہیں جو اپنے سے متعلق بچوں کو اجنبی آغوش میں اور سمیّت آمیز ہوا میں بغیر کسی حفاظت کے بھیجدیتے ہیں۔ یہ لوگ بعد میں خود پشیمان ہوں گے۔ جب وہ دیکھیں گے کہ ان بچوں کے دل میں بڑے ہونے کے بعد ان کا کوئی احترام نہیں رہا۔ وہ انہیں بیوقوف سمجھنے لگے، اور ان پر مضحکہ کرنے لگے یہ باتیں کبھی نہ ہوتیں اگر وہ پہلے ہی ان کو صحیح تعلیمات سے روشناس کر دیتے۔ بہت ممکن ہے کہ یہ لڑکے بھی جب کبھی ان کے قوائے عقلیہ بیدار ہوں اور آنکھیں کھلیں، تو ان بزرگوں کو دل ہی دل میں نفرین کریں کہ انہوں نے ہمارے ساتھ صحیح طریقہ اختیار نہیں کیا۔

حدیث میں ہے:۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ يَلْزِمُ الْوَالِدَيْنِ مِنَ الْعُقُوْقِ لِوَلَدِهِمَا مَا يَلْزِمُ الْوَلَدُ لَهُمَا مِنْ عُقُوْقِهِمَا" رسالتمآبؐ نے فرمایا کہ والدین اپنی اولاد کے حقوق کے لحاظ سے اسی طرح عاق ہوتے ہیں۔ جس طرح اولاد اپنے والدین کے حقوق ادا نہ کرنے میں" بات یہ ہے کہ "عاق" کے معنی تو نافرمان کے ہیں۔ باپ کی اطاعت فرزند اولاد پر واجب کی ہے۔ اس لئے اگر وہ

ان کی اطاعت نہ کرے تو نافرمان ہے۔ یہ جو عام طور پر کہا جاتا ہے
کہ فلاں باپ نے اپنی اولاد کو عاق کر دیا۔ اس کے کوئی معنی نہیں ہیں
اگر وہ نافرمان ہے، تو عاق ہے۔ چاہے یہ باپ نہ کہے کہ میں نے
عاق کر دیا۔ اور اگر وہ اطاعت گزار ہے تو باپ لاکھ کسی کے کہنے
سننے سے اس کو عاق کرنا چاہے وہ عاق نہیں ہوگا۔ پھر اسی طرح
خدا نے جو حقوق اولاد کی تعلیم و تربیت کے باپ پر عائد کئے ہیں
اگر وہ ان کو ادا نہ کرے تو وہ بھی نافرمان ہے۔ اس لئے "عاق"
کے مفہوم میں داخل ہے۔

تربیت کے صحیح و مناسب اصول

اولاد کی تربیت بڑی دشوار اور نازک چیز ہے۔ معمولی معمولی
بداخلاقیاں اولاد کے مزاج اخلاقی کے خراب ہونیکا باعث ہو سکتی ہیں
امام موسیٰ کاظمؑ فرماتے ہیں اِذَا وَعَدْتُمُ الصِّبْیَانَ فَفُوْا لَھُمْ
"جب بچوں سے کوئی وعدہ کرو تو اسے پورا کرو"
اگر والدین نے وعدہ خلافیاں کیں تو بچوں کے دماغ پر یہ اثر
پڑ سکتا ہے کہ جھوٹ بولنا یا وعدہ خلافی کرنا کوئی برا کام نہیں ہے
اس لئے وہ اپنی آئندہ زندگی میں اس جرم کی کوئی اہمیت
نہیں سمجھیں گے۔
بیشک باپ کی تعلیم و تربیت اپنی اولاد کیلئے اس قدر خشک نہیں

ہونا چاہئے، جیسے ایک کالج کا معلّم طالب علموں کے لئے کہ اس کو اتنے وقت
میں تعلیم سے غرض ہے اور کچھ نہیں۔ بچوں کی تربیت میں تعلیمی سختی کے
ساتھ مشفقانہ محبت کے مظاہرات کی بھی ضرورت ہے اور شریعت
جو ایک فطری زندگی کی تشکیل کرنا چاہتی ہے، وہ اس کو خاص اہمیت
دیتی ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتی کہ آپ اپنی اولاد کے سامنے تیوریوں پہ
بل ڈالے رہئیے۔ اور ہمیشہ ان سے ڈانٹ ہی کر بات کیجئے۔ بلکہ حسب
موقع اظہار محبت بھی کیجئے اور یہ وہ چیز ہے جس میں شخصی وقار، متانت
شائستگی کے حدود بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ بچوں کو پیار کرنا، ملاطفت
سے کام لینا ایک طرح کی عبادت ہے۔ رسول اللہؐ کی حدیث ہے
مَنْ قَبَّلَ وَلَدَہٗ کَتَبَ اللّٰہُ لَہٗ حَسَنَۃً "جو اپنے بچہ کو پیار کرتا ہے خدا
ایک نیکی اس کے نامۂ عمل میں تحریر فرماتا ہے" رسالتمآبؐ سے بڑھ
کر عالم میں کس کی عظمت ہو گی۔ مگر آپ خود بچوں کے ساتھ جو طرز عمل
اختیار فرماتے تھے۔ اس کے تاریخ و حدیث دونوں گواہ ہیں۔ بعض
انانیت پسند اور متکبر اشخاص اس وقت بھی اس پر اعتراض کرتے
تھے اور بہت سے لوگ اس وقت بھی دبی زبان سے کہتے ہیں کہ یہ
چیزیں عظمت کے خلاف ہیں مگر یہ لوگ عظمت نفس کا صحیح معیار
نہیں سمجھتے۔ ہر چیز کا ایک محل ہوتا ہے اور کبھی موقع ہوتا ہے کہ انسان
باختیار خود اپنی عظمت کے درجہ سے نیچے اترے۔ بچوں کے
ساتھ وقار و تمکنت کو قائم رکھنا اصول انسانیت کے خلاف ہے۔

روایت میں ہے کہ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ یُقَبِّلُ الْحَسَنَ وَالْحُسَیْنَ فَقَالَ الْاَقْرَعُ بْنُ حَابِسٍ اِنَّ لِیْ عَشَرَۃً مِنَ الْوَلَدِ مَا قَبَّلْتُ اَحَدًا مِنْهُمْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ مَنْ لَا یَرْحَمُ لَا یُرْحَمُ رسالتمآب امام حسنؑ و امام حسینؑ اپنے دونوں نواسوں کو پیار کر رہے تھے، اقرع بن حابس نے (یہ نجد کے رؤسا میں سے تھا) کہا کہ میرے تو دس فرزند ہیں۔ میں نے کبھی کسی کو پیار نہیں کیا۔ حضرتؐ نے فرمایا کہ جس کے دل میں شفقت و مہربانی نہ ہو وہ خود قابل مہربانی نہیں ہے"

بچوں کے ساتھ یہ طریقہ بھی اختیار کرنا غلط ہے کہ شروع سے ہر بات میں ان کو ڈرایا جائے اور خوف و دہشت دلائی جائے "ہوّا" اور "جوجو" اور "بی شادی" وغیرہ کے ناموں سے خواہ مخواہ ڈرانا بالکل اصول تربیت کے خلاف ہے۔ اسی طرح یہ طریقہ کہ بچوں کو تنہا مقام پر جانے نہ دیا جائے مُردوں سے الگ ہٹایا جائے مُردہ کی صورت نہ دیکھنے دی جائے یہ سب طریقے صحیح نہیں ہیں۔ ایسے لوگ اپنے بچوں کو ان کی آئندہ زندگی میں مشکلات کے مقابلہ کے لئے تیار نہیں کرتے بلکہ ان کے نفس میں کمزوری پیدا کرتے ہیں۔ یہ چیز عرب میں نہیں تھی۔ اس لئے احادیث میں اس کا تذکرہ نہیں ملتا۔ بے شک آپ کے یہاں کے علماء اور رہنمایان دین کو اس کا احساس تھا۔ چنانچہ جناب تاج العلماء

نے تحریر فرمایا ہے کہ ہمارے والد ماجد جناب سلطان العلماء طاب ثراہ ہم کو بچپنے سے خاص طور پر مُردوں کی بھیانک صورتیں دیکھنے کی عادت ڈالتے تھے اور کسی جگہ کچھ ڈاکو مارے گئے اور ان کے سر وہاں سے بھیجے گئے (کیونکہ اس زمانہ میں محکمۂ فوجداری اور دیوانی سب سلطان العلماء کے اختیار میں تھا) تو وہ سر ایک روز تک ہمارے پلنگ کے قریب رکھے رہے۔ یہ سب اسی لئے تھا کہ خوف دل سے نکلے اور بچہ میں ایسے مناظر کے دیکھنے سے رعب و دہشت نہ پیدا ہو۔

تحصیل علم کی اہمیّت

اور

علم کے شرعی حدود

تعلیم و تربیت انسان کی زندگی کے لئے لازمی چیز ہے۔ اور اسلام نے علم کی اہمیت پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔ اسی سلسلہ میں ضرورت ہے کہ علم کے شرعی حدود پر تبصرہ کر دیا جائے۔ حدیث میں ہے اَلْعِلْمُ فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ "علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے"

اس میں عام طور پر "ومسلمۃ" کا جزو حدیث کے آخر میں زبان زد خلق ہے۔ وہ بالکل الحاقی ہے۔ اصل حدیث میں اسکا وجود نہیں ہے۔

اس کے ساتھ قرآن مجید ہے "لَا يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ" ہرگز برابر نہیں ہیں وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور وہ کہ جو علم نہیں رکھتے۔"

بعض لوگ اس قسم کے آیات و احادیث کو لے کر یہ استدلال پیش کرتے ہیں۔ کہ اس میں کسی علم خاص کی قید نہیں ہے۔ لہٰذا ہر علم کا حاصل کرنا مطلوب شرع ہوگا۔ اور انسان کا فرض مذہبی قرار پائے گا۔

کیا حقیقۃً یہ استدلال درست ہے؟

علم کے معنے لغت میں دانستن یعنی جاننے ہی کے ہیں۔ لیکن کیا ہر چیز کا جاننا ہر شخص کے لئے سبب فضیلت ہے؟ اگر ایسا ہو تو دنیا میں عالم اور جاہل کی تفریق ہی بیکار ہے کیونکہ ہر انسان کو اپنے شعبۂ زندگی میں کچھ خاص معلومات ہوتے ہیں جو دوسروں کو نہیں ہیں۔

ایک جنگل میں بسر کرنے والا فقیر جنگل کی بہت سی چیزوں کا علم رکھتا ہے۔ جو بڑے فلاسفر اور حکماء کو نہیں معلوم اور ایک دریائی سفر کرنے والا کشتی ران دریا اور اس کے جزائر کے متعلق بہت سے معلومات رکھتا ہے۔ ایک کاشتکار زمین کے بونے، جوتنے کے اسرار جانتا ہے۔ ایک لوہار لوہے کے خواص و کیفیات کے متعلق علم رکھتا ہے اور ہر شخص اپنے خاندان اپنے آباؤ اجداد اور خاص اپنے گھر کے متعلق وہ بہت باتیں جانتا ہے۔ جو کسی دوسرے کو معلوم

نہیں ہیں۔ اگر یہی جاننا صرف معیارِ علم ہو تو پھر جاہل کا وجود ہی باقی نہیں رہتا اور اس صورت میں یہ کہنا کہ عالم اور غیر عالم مساوی نہیں ہیں ایک بے معنی بات ہے۔ کیونکہ غیر عالم کی صنف تو عنقا ہے۔ جس کا وجود ہی نہیں ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ وسیع اور عام مفہوم مراد نہیں ہے بلکہ اسکے لئے کوئی اصطلاحی مفہوم قرار دیا گیا ہے۔ یا اس کی کوئی خاص صنف مراد ہے۔ اب ہم کو ضرورت ہے کہ ہم اس اصلاحی مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کریں یا اُس صنفِ خاص کو دریافت کریں جو واقعی مقصود ہے۔

اس کے لئے جب ہم عقل سے کام لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ جاننا انسان کے لئے قابلِ مدح ہے جو کارآمد حیثیت رکھتا ہو۔

لیکن "کارآمد" کی تعیین ہر انسان کے نقطۂ نظر سے بدل جاتی ہے۔ ایک کسان اس کو کارآمد سمجھے گا جو اس کے شعبہ سے متعلق ہے ایک طبیب اسے کارآمد سمجھے گا جو اس کے مطلب کی چیز ہے اور چونکہ یہاں نقطۂ نظر کی صحت و عدم صحت سے بحث نہیں ہے۔ اس لئے یہ بھی کہوں کہ ایک مغنّی یعنی گانے والا اس چیز کو کارآمد کہے گا۔ جو اس کے مذاق سے تعلق رکھتی ہو۔ اور جب اس کا معیار یہ ہے تو شارع اسی چیز کو علم سمجھے گا۔ جو اس کے نقطۂ نظر سے کارآمد ہو۔

اب دیکھیے کہ شارع کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ انسان کی اعتقادی و عملی

اس کے ساتھ قرآن مجید ہے لَا يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ "ہرگز برابر نہیں ہیں وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور وہ کہ جو علم نہیں رکھتے۔"

بعض لوگ اس قسم کے آیات و احادیث کو لے کر یہ استدلال پیش کرتے ہیں۔ کہ اس میں کسی علم خاص کی قید نہیں ہے۔ لہٰذا ہر علم کا حاصل کرنا مطلوب شرع ہوگا۔ اور انسان کا فرض مذہبی قرار پائے گا۔

کیا حقیقۃً یہ استدلال درست ہے؟

علم کے معنے لغت میں دانستن یعنی جاننے ہی کے ہیں۔ لیکن کیا ہر چیز کا جاننا ہر شخص کے لئے سبب فضیلت ہے؟ اگر ایسا ہو تو دنیا میں عالم اور جاہل کی تفریق ہی بیکار ہے کیونکہ ہر انسان کو اپنے شعبۂ زندگی میں کچھ خاص معلومات ہوتے ہیں جو دوسروں کو نہیں ہیں۔

ایک جنگل میں بسر کرنے والا فقیر جنگل کی بہت سی چیزوں کا علم رکھتا ہے۔ جو بڑے فلاسفر اور حکماء کو نہیں معلوم اور ایک دریائی سفر کرنے والا کشتی ران دریا اور اس کے جزائر کے متعلق بہت سے معلومات رکھتا ہے۔ ایک کاشتکار زمین کے بونے، جوتنے کے اسرار جانتا ہے۔ ایک لوہار لوہے کے خواص و کیفیات کے متعلق علم رکھتا ہے اور ہر شخص اپنے خاندان اپنے آباؤ اجداد اور خاص اپنے گھر کے متعلق وہ بہت باتیں جانتا ہے۔ جو کسی دوسرے کو معلوم

نہیں ہیں۔ اگر یہی جاننا صرف معیارِ علم ہو تو پھر جاہل کا وجود ہی باقی نہیں رہتا اور اس صورت میں یہ کہنا کہ عالم اور غیر عالم مساوی نہیں ہیں ایک بے معنی بات ہے۔ کیونکہ غیر عالم کی صنف تو عنقا ہے۔ جس کا وجود ہی نہیں ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ وسیع اور عام مفہوم مراد نہیں ہے بلکہ اسکے لئے کوئی اصطلاحی مفہوم قرار دیا گیا ہے۔ یا اس کی کوئی خاص صنف مراد ہے۔ اب ہم کو ضرورت ہے کہ ہم اس اصلاحی مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کریں یا اُس صنفِ خاص کو دریافت کریں جو واقعی مقصود ہے۔

اس کے لئے جب ہم عقل سے کام لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ جاننا انسان کے لئے قابلِ مدح ہے جو کار آمد حیثیت رکھتا ہو۔

لیکن "کار آمد" کی تعیین ہر انسان کے نقطۂ نظر سے بدل جاتی ہے۔ ایک کسان اس کو کار آمد سمجھے گا جو اس کے شعبہ سے متعلق ہے ایک طبیب اسے کار آمد سمجھے گا جو اس کے مطلب کی چیز ہے اور چونکہ یہاں نقطۂ نظر کی صحت و عدم صحت سے بحث نہیں ہے۔ اس لئے یہ بھی کہوں کہ ایک مغنّی یعنی گانے والا اس چیز کو کار آمد کہے گا۔ جو اس کے مذاق سے تعلق رکھتی ہو۔ اور جب اس کا معیار یہ ہے تو شارع اسی چیز کو علم سمجھے گا۔ جو اس کے نقطۂ نظر سے کار آمد ہو۔

اب دیکھیے کہ شارع کا نقطۂ نظر کیا ہے۔ انسان کی اعتقادی و عملی

آراستگی اور تکمیل لیکن اس آراستگی کے درجے ہیں - ایک درجہ وہ ہے جو ہر انسان کے لئے ضروری ہے اور اس سے کوئی مستثنیٰ نہیں ہے - اُس سے متعلق علم بھی واجب ہونا چاہئے اور ایک وہ درجہ ہے جس تک پہنچنا ممدوح و مستحسن ہے - اس سے متعلق علم بھی ایسا ہی ہوگا - اور بعض امور وہ ہیں جو خود انسان کے لئے جواز کی حد میں ہیں، نہ ان کے فعل کو کوئی خاص ترجیح ہے نہ ترک کو، ان کا علم بھی اس حیثیت سے جائز و مباح کی حیثیت رکھتا ہوگا - وہ نہ واجب ہوگا اور نہ مستحب

اب دیکھیے وہ چیز جو ہر انسان کے لئے ضروری ہے وہ کیا ہے؟

وہ اصول دین کا اجمالی دلیل کے ساتھ اعتقاد حاصل ہونا، اور اعمال و افعال میں واجبات کا پابند اور محرمات کا تارک ہونا یہ وہ کم از کم درجہ ہے جو ہر انسان سے مطلوب ہے اور کوئی شخص اس سے مستثنیٰ نہیں ہے - اس لئے یہ مقدار علم کی واجب عینی ہوگی یعنی ہر ہر متنفس کا افراد انسان میں سے بلوغ و عقل کے ساتھ یہ فرض ہوگا کہ وہ مسائل اعتقادیہ کو دلیل اجمالی کے ساتھ اور واجبات ومحرمات کے شرعی احکام کو جانتا ہو اور انکی معرفت حاصل کرے۔

اس کے بعد اصول عقاید کی تفصیلی واقفیت حاصل کرنا بسط و تشریح کے ساتھ اور مسائل دینیہ کو نظر و استدلال کے ساتھ جاننا جس کا نام اجتہاد، یہ ہر انسان پر فرض عین نہیں ہے - ورنہ پھر دنیا کی دوسری ضرورتیں پوری نہ ہوسکتیں

لیکن چونکہ مختلف ادیان و مذاہب کے اعتراضات کو دور کرنا، اور ناواقف افراد کو صحیح مسائل سے واقف بنانا ایسے افراد کے وجود پر موقوف ہے - اس لئے ایک جماعت کا ہر زمانہ میں رہنا ضروری ہے - جو علم کے اس درجہ پر فائز ہو - اس لئے اس درجہ پر علم کی تحصیل کرنا واجب کفائی ہے - یعنی سب پر فرض ہے لیکن جب ایک یا چند افراد ایسے پیدا ہو جائیں جو اس ضرورت کو پورا کر سکتے ہوں تو پھر دوسروں سے یہ وجوب ساقط ہو جائے گا - اسی طرح دوسرے بعض علوم جن پر نظم زندگی موقوف ہے جیسے علم طب چونکہ عام نظام اسباب کی بنا پر امراض کے دفعیہ کا ذریعہ علاج میں منحصر ہے اس لئے ضرورت ہے کہ ایسے افراد موجود رہیں جو انسان کی صحت جسمانی کی نگرانی کر سکیں۔

یوں ہی غذا اور لباس اور سکونت وغیرہ کے ضروریات کے لئے وہ صنعتیں ہیں جن سے کہ ضروریات پورے ہوتے ہیں بقدر ضرورت کفائی حیثیت سے واجب ہیں۔

اس کے بعد وہ علوم جن سے مقصود کسی طرح خلق خدا کو جائز فائدہ پہنچانا ہو لیکن وہ ضروریات زندگی میں داخل نہ ہوں تو وہ مستحب قرار پائیں گے - یعنی جب اس قصد سے انجام دئیے جائیں کہ ان سے خلق کو فائدہ حاصل ہو تو ان پر ثواب بھی عطا ہوگا۔

باقی رہے ایسے علم جن پر کوئی اس طرح کا مقصد مترتب نہیں ہے مثلاً فلاں ملک سے فلاں ملک کا فاصلہ کتنا ہے؟ وہاں کی مردم شماری کتنی ہے؟ وہاں کی پیداوار کیا ہے؟ وہاں کی اقتصادی حالت کیسی ہے؟ وہاں کا نظامِ سلطنت کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

یا یہ کہ آج سے اتنے صدی پہلے کون بادشاہ تھا؟ اس کے دورِ حکومت کے اہم خصوصیات کیا تھے؟ اس کے زمانہ میں حدودِ سلطنت کتنے تھے؟ اس کے زمانہ میں کون سے انقلابات ہوئے اور کیا کیا اہم واقعات رونما ہوئے؟ وغیرہ وغیرہ۔

ان چیزوں کا علم حاصل کرنا جائز و مباح کے حدود میں آئے گا یعنی انسان اپنے فاضل اوقات زندگی میں ان باتوں کو بھی جان لے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ یہی وہ چیز ہے جس کو رسالتمآب صلعم نے فرمایا اس وقت جب آپ مسجد میں تشریف لائے اور ملاحظہ فرمایا کہ ایک شخص کے گرد لوگوں کا مجمع ہے۔ حضرت صلعم نے پوچھا یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا "یہ علامہ ہے"

آپ نے فرمایا کہ "وَمَا عَلَّامَۃٌ" یہ علامہ کیا چیز ہے؟

لوگوں نے کہا یہ انسان عرب اور تواریخ عرب کی لڑائیوں کے حالات سے واقف ہے۔ حضرتؐ نے فرمایا "یہ ایسا علم ہے کہ نہ اس سے فائدہ پہنچتا ہے نہ نقصان"

دیکھئے یہاں لغوی حیثیت کا لحاظ کیا گیا ہے جو "علم" کا اطلاق

اس پر کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے بعد فرماتے ہیں اَلْعِلْمُ ثَلٰثَۃٌ اٰیَۃٌ مُحْکَمَۃٌ اَوْ سُنَّۃٌ قَائِمَۃٌ اَوْ فَرِیْضَۃٌ عَادِلَۃٌ علم تو بس تین ہیں (یہ علم کے اصطلاحی معنی ہیں جو شرعی نقطۂ نظر سے بیان کئے گئے ہیں)

ایک محکم آیات، دوسرے غیر منسوخ احادیث، تیسرے احکام واجبہ۔

فرماتے ہیں "وَمَا عَدَا ذٰلِکَ فَضْلٌ" اس کے سوا جو کچھ ہے وہ پھر فاضل چیز ہے"

اور اگر علم ایسا ہو جس سے مضرت پہنچنے کا اندیشہ ہے یا اس کا معصیت سے تعلق ہے تو وہ حرام ہوگا۔ جیسے علم موسیقی، وہ بھی اس بنا پر کہ علم اس کا موقوف عمل پر ہے۔ ورنہ ان مسائل کو نفظی حیثیت سے سُننا یا جاننا حرام نہیں ہے۔ علمِ سحر، اس کا حاصل کرنا بھی حرام ہے مگر یہ کہ ردّ سحر کے لئے ہو تو اس وقت میں جائز ہوگا۔ تیسرے کتب ضلال یعنی ادیان باطلہ کی کتابوں کا خرید کرنا، محفوظ کرنا، مطالعہ کرنا اور نشر و اشاعت کرنا، یہ سب ممنوع ہے جب تک اس کے ساتھ ردّ و ابطال کا قصد نہ ہو، اگر یہ قصد ہو تو جائز ہوگا۔ بلکہ کسی حد تک واجب ہوگا۔ تاکہ ان شبہات و اعتراضات کا دفعیہ ہو سکے اور حمایتِ حق کا فرض انجام پذیر ہو۔

تعلیمِ نسواں

عِلم کا معیار یہ قرار پایا کہ جو کار آمد علم ہو وہ مستحسن ہے۔ مگر کار آمد ہونا ہر شے کے لئے اس کے اعتبار سے ہوتا ہے یعنی جو مقصد کسی شے کا ہو اور جو اس کا مخصوص عمل ہو اس کی حیثیت سے مفید ہو تو وہ کار آمد سمجھا جائے گا اور اگر اس کی حیثیت سے مفید نہیں ہے تو بے کار ہے؛

قدرت نے نوعِ انسانی کو دو صنفوں پر منقسم کیا ہے، مرد اور عورت ان کے خواص فطری مختلف، ضروریاتِ زندگی مختلف، فرائض اور اعمال مختلف اس لئے کیسے ہو سکتا ہے کہ تعلیم و تربیت میں ان کو ایک ہی صف میں جگہ دیدی جائے اور دونوں کے لئے ایک ہی طرح کی تعلیم کو کار آمد سمجھا جائے۔

بے شک عورت کو ترقی حاصل کرنا چاہئے۔ جس طرح مردوں کو ترقی کرنا چاہئے۔ لیکن مرد کو مرد رہ کے ترقی کرنا لازم ہے اور عورت کو عورت رہ کے۔ دوسرے لفظوں میں یہ عرض کروں کہ تعلیم مرد کو وہ ہونی چاہئے جس سے وہ کامل مرد بن جائے اور عورت کو ایسی تعلیم جس سے وہ کامل عورت بنے۔

یہ خواہش کہ عورتوں کو میدانِ عمل میں بالکل مردوں کے دوش بدوش آنا چاہئے اس وقت صحیح ہو سکتی تھی جب مرد اُن فرائض و اعمال میں عورت کے ساتھ شریک ہونے پر تیار ہو جاتا جو عورت سے متعلق ہیں لیکن جبکہ فطرت نے عورت کیلئے کچھ مخصوص فرائض قرار دے دیئے ہیں جو بالکل اسی کے ساتھ

وابستہ ہیں اور جن میں کسی طرح مرد اس کے ساتھ تبادلہ نہیں کر سکتا، تو پھر مردوں کے لئے بھی کچھ فرائض مخصوص ہونا چاہئیں، جن میں وہ عورتوں کو شرکت کی دعوت نہ دیں۔

یہ بھی عورت کی طبیعت کا ایک کمزور پہلو ہے کہ وہ مرد کی باتوں میں آجاتی ہے۔ جس طرح مردوں نے اس کو رکھا اُسی کو اس نے اپنے لئے بہتر سمجھا اور آج جبکہ مرد ہی "آزادی آزادی" پکار رہے ہیں اور یہ صدا بلند کر رہے ہیں کہ عورتوں کو میدانِ ترقی میں باہر آنا چاہئے تو اسے بھی عورتیں سمجھ رہی ہیں کہ یہ ہماری خیر خواہی ہے اور ہمارے لئے یہی مناسب ہے، حالانکہ وہ دیکھیں تو اس میں صاف مردوں کی خود غرضی نمایاں ہو گی معلوم ہو گا کہ مرد مشکلاتِ زندگی کے پورا کرنے سے ہمت ہار چکا، اور وہ عورت کو صرف اپنی مدد کے لئے بلا رہا ہے۔ حالانکہ اس سے عورت کو خود کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ بلکہ اسکی "نسائیت" کو انتہائی نقصان پہنچیگا۔

مرد اور عورت کے تشکیلِ جسمانی اور ان کے طبعی نظام زندگانی ہی سے ان کا مختلف المقصد ہونا بالکل نمایاں ہے۔ پھر جب یہ اختلاف اپنے مقام پر قائم ہے اور مٹ نہیں سکتا۔ تو خواہ مخواہ ان کو کھینچ کر مرد کے پہلو میں لانے سے فائدہ کیا ہے۔

عورت بہر حال عورت ہے۔ اور اس کے لئے صحیح تعلیم وہی ہو گی جو اس کو ایک ترقی یافتہ عورت بنا دے۔ تعلیم

بے شک ضروری ہے۔ لیکن وہ اس کے لحاظ سے ہونا چاہئے۔

جہاں تک اعتقادی مسائل کا تعلق ہے مرد اور عورت دونوں مشترک ہیں۔ اسی طرح فرائض الٰہیہ جس طرح مردوں کے لئے ہیں اسی طرح عورتوں کے لئے۔ لہٰذا ان چیزوں کا علم حاصل ہونا جس طرح مردوں کے لئے ضروری ہے، اسی طرح عورتوں کے لئے بھی ؛

بے شک احکامِ شرعیہ میں ممکن ہے کہ بعض چیزیں ایسی ہوں جن کا تعلق عورتوں ہی سے ہے مردوں سے نہیں، جیسے خاص خاص مسائل طہارت، یا جن کا تعلق مردوں کے ساتھ ہو عورتوں کے ساتھ نہیں، جیسے احکامِ جہاد، اس بنا پر کہ جہاد عورتوں سے ساقط ہے، ایسے احکام کے ان سب کو جاننے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ جس کی ضرورتوں سے اُن احکام کا تعلق ہے اسی صنف کو اس کا علم بھی حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔

اس کے آگے علم کے وہ درجے ہیں جو نظامِ دنیا کے لحاظ سے ضروری ہیں۔ اُن میں تفریق پیدا ہو جانا ناگزیر ہے۔ کیونکہ مرد کے ضروریات عورت سے مختلف ہیں۔

اسلام نے عورت اور مرد کے درمیان داخلی اور خارجی حدود عمل کی تقسیم کر دی ہے۔ طلب معیشت اور جد و جہد مرد کا کام ہے۔ اور انتظامِ خانہ داری عورت سے متعلق ہے۔ اس لئے عورت کے لئے مقدم ان چیزوں کا حاصل کرنا ہے، جو اس کی

ضروریات سے متعلق ہیں ؛

اسی بنا پر حدیث میں وارد ہوا ہے عَلِّمُوْهُنَّ الْغَزْلَ وَالْخِيَاطَةَ وَلَا تُعَلِّمُوْهُنَّ الْكِتَابَةَ "انہیں کاتنے اور سینے کی تعلیم دو اور انہیں انشا پردازی اور تحریر کی تعلیم نہ دو"

ظاہر میں اس حدیث سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ کتابت کا سیکھنا عورت کیلئے ممنوع ہے، اس لئے بعض علماء بھی فتوے دیتے ہیں کہ کتابت اس کے لئے مکروہ ہے مگر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔

جس طرح امر یعنی کسی شے کی طلب وجوب یا استحباب کا پتہ دیتی ہے مگر اس وقت کہ جب اس کے پہلے نہی نہ ہو یا توہم ممانعت کا نہ ہو۔ لیکن اگر پہلے کسی امر کی ممانعت ہوئی ہو اور پھر یہ کہا جائے کہ "اس کام کو کرو، تو اس سے صرف اجازت مقصود ہوتی ہے۔ کہ وہ حکم اب برطرف ہو گیا۔ یا کسی شے کے متعلق اس توہم کا موقع ہو کہ وہ ممنوع ہے اور پھر اس کا حکم دیا جائے تو اس سے مطلب یہ ہوگا کہ اس توہم ممانعت کا دفعیہ کیا جائے۔ اسی طرح اگر کسی شے کے حکم وجوبی یا استحبابی کے بعد اس سے منع وارد ہو تو وہ حرمت و کراہت کی دلیل نہ ہو گی۔ بلکہ اس سے مقصود یہ ہوگا کہ اس کا حکم اب نہیں ہے۔ یا کسی شے کے متعلق استحباب و مطلوبیت کا شبہ ہو اور اس کے متعلق نہی وارد ہو تو اس سے

اس مطلوبیت کی نفی مقصود ہو گی اور بس ؞

اب دیکھئے کہ چونکہ مردوں کے لئے کتابت حاصل کرنیکی تاکید ہے۔ اور ظاہری طور پر اس خیال کی کافی گنجائش ہے کہ عورتوں کے واسطے بھی کتابت حاصل کرنے کا حکم ہوگا۔ نیز غزل وخیاطت کا ان کے لئے پہلے حکم دیا گیا ہے۔ لہٰذا اس لَا تُعَلِّمُوْهُنَّ الْكِتَابَة "انہیں کتابت کی تعلیم نہ دو" کے معنی صرف اتنے ہونگے کہ ان کیلئے کتابت کی تعلیم کا حکم اسطرح کا نہیں ہے جسطرح کاتنے اور سینے پرونے کا، یا مردوں کیلئے جسطرح اس کی تاکید ہے۔ اس طرح عورتوں کیلئے نہیں ہے ؞ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ وہ ان کے لئے حرام یا مکروہ ہے۔ عورتوں کو تعلیم حاصل کرنے سے کوئی مانع نہیں ہے۔ علاوہ ضروری اعتقادات اور مسائل کے اس حدتک انکو دوسرے معلومات حاصل ہو جانا بہتر ہیں، جو نظامِ زندگی میں مفید ہوں جیسے اصول حفظانِ صحت وغیرہ پھر اگر تمام ضروری باتوں کے پورا کرنے کے بعد اُن کے پاس وقت فاضل ہو تو دوسرے علوم کے حاصل کرنے میں بھی کوئی روک ٹوک نہیں۔ مگر ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے نسوانی خصوصیات محفوظ ہیں ؞

اس کی اجازت کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ کہ وہ اسکولوں اور کالجوں میں جاکر مردوں کے دوش بدوش تعلیم

حاصل کریں ؞

آج تعلیم نسواں کے مبلغین کی طرف سے مثال میں پیش کیا جاتا ہے۔ سیدۂ عالمؑ کو کہ ان کا علمی پایہ کتنا بلند تھا۔ اور جناب زینبؑ کو جن کے متعلق امامؑ نے فرمایا عَالِمَةٌ غَيْرُ مُعَلَّمَةٍ لیکن اس سلسلہ میں اس پر غور نہیں کیا جاتا کہ سیدہ عالم کے ذرائع معلومات کیا تھے۔ اسکول اور کالج تو بہت دور ہے۔ دنیا کی تاریخ سے یہ تک ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ سیدۂ عالم کبھی مسجد میں اپنے پدر بزرگوار کے موعظہ میں جاکر شریک ہوئی ہیں ؞

بے شک یہ روایت سُنی ہے کہ جب امام حسنؑ اور امام حسینؑ مسجد سے آتے تھے تو سیدہ اپنے بچّوں سے اکثر دریافت کر لیتی تھیں۔ کہ بابا نے موعظہ میں کیا بیان فرمایا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ سیّدہ کو شوق تھا ان معلومات کے حاصل کرنے کا اور یہ بھی بالکل ظاہر ہے کہ رسول اللہؐ کو سیّدہ کی خاطر انتہائی عزیز تھی مگر پھر کچھ پابندی تھی، جو نہ سیّدہ نے مسجد میں جانے کی خواہش کی اور نہ رسولؐ نے سیّدہ کو اس کی اجازت دی ؞

سیّدہ عالمؑ نے ہمیشہ کے لئے صنف اناث کے واسطے مثال قائم کردی کہ اگر وہ تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہوں تو اُس کا طریقہ یہ ہے کہ مرد تعلیم یافتہ ہوں اور وہ خود اپنی عورتوں کو گھر کے اندر تعلیم دیں۔

اس میں بڑے اور چھوٹے کا سوال بھی کوئی چیز نہیں - اگر موقع ہو تو
ماں اپنے بیٹے سے علمی فائدہ حاصل کر سکتی ہے ؛
ممکن ہے یہ کہا جائے کہ شرعی پردہ عورتوں کے لئے بس نفع اور چھ
کر گھر سے باہر نکلنے کا مانع نہیں ہے - مگر معلوم ہونا چاہئے - کہ
ضرورت کے لحاظ سے جواز کے حدود چاہے کچھ ہوں لیکن
مطلوب اولین شرع کا عورتوں کے لئے گھروں کے اندر ہی رہنا
ہے- اگر ایسا نہ ہوتا تو عورتوں کے واسطے فرائض شرعیہ میں
استثناء نہ کیا جاتا ؛

نماز جمعہ اس صورت میں کہ جب وجوب عینی کی صورت رکھتی ہو
مرد کے لئے واجب، عورتوں پر سے وجوب ساقط ؛
نماز جماعت کی فضیلت مرد کیلئے ثابت، عورتوں کیلئے نہیں.
مسجد کی فضیلت، مرد کیلئے اس کے درجے بلند ہوتے ہیں، کثرتِ
اجتماع کے لحاظ سے، اس لئے گھر سے زیادہ ثواب مسجد میں اور
مسجدِ محلہ سے زیادہ ثواب مسجد جامع میں، کیونکہ اجتماع وہاں زیادہ
ہوتا ہے- مگر عورت کیلئے یہ حکم کہ خارج بیت یعنی گھر کے باہر
نماز پڑھنے سے زیادہ ثواب گھر کے اندر کا اور صحن سے زیادہ ثواب
اندر کے دالان یا کوٹھڑی کا ؛
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شرع کا نقطۂ نظر کیا ہے؛ مجھے ان لوگوں سے
جو تعلیم نسواں کے حامی ہیں یا پردہ کے مخالف ہیں اسکی شکایت نہیں ہے

کہ وہ یہ رائے کیوں رکھتے ہیں- ممکن ہے ان کے دماغ نے یہی فیصلہ کیا ہو
مگر مجھے ان سے شکایت ہے اس امر کی کہ وہ شریعتِ اسلام کے ہدایات کو
اپنے موافق قرار دینا چاہتے ہیں- حالانکہ یہ بالکل غلط ہے- یوں آپ اس
کو نہ مانتے ہوں یہ آپ کا فعل ہے- مگر یہ نہ کہئے کہ شریعت بھی
ہمارے ہی موافق ہے ؛
والدین اگر پابندِ شریعت ہیں تو انہیں اپنی لڑکیوں کو اخلاقی
تربیت کے ساتھ ضروری تعلیم بھی ضرور دینا چاہیئے- مگر اس کا خیال
رہے کہ وہ ان کے مزاجِ فطری کے خراب کرنے کا ذریعہ نہ ہو
اور ان کی شرم و حیا کا سرمایہ جو ان کا اعلےٰ ترین زیور ہے کسی طرح
برباد نہ ہونے پائے ؛

عبادت کی ابتدائی مشق

اور
نماز کی تاکید

جس طرح بچوں کو تعلیم کا حکم دیا گیا ہے اور اخلاقی تربیت کی
ضرورت پر زور دیا گیا ہے اسی طرح انہیں عبادت وطاعات کی
عادت ڈالنے کی بھی تاکید ہے۔
چھ یا سات برس کی عمر سے نماز پڑھنے کی عادت ڈالنا چاہیئے اس میں
جتنا زمانہ گزرتا جائے اور بلوغ کی منزل قریب آتی جائے اتنی زیادہ

تشدد و تاکید کی ضرورت ہے۔

امام جعفر صادقؑ کی حدیث ہے۔ آپ سے دریافت کیا گیا "فِی کَمْ یُؤْخَذُ الصَّبِیُّ بِالصَّلٰوۃِ" کتنی وہ عمر ہے جس میں بچہ کو نماز کا پابند بنانا چاہیئے حضرت نے فرمایا: "فِیْمَا بَیْنَ سَبْعِ سِنِیْنَ وَسِتِّ سِنِیْنَ" سات اور چھ برس کے درمیان میں" اس "درمیان" کے معنی وہی ہیں جنہیں میں نے اس کے پہلے تعلیم و تربیت کے مسئلہ میں واضح کیا ہے کہ درحقیقت شارع نے اس مقام پر تعیدی پابندی سے نہیں کام لیا ہے بلکہ ایک تخمینہ بتلایا ہے کہ تقریباً اتنی عمر میں بچہ عموماً سمجھنے اور سیکھنے کے لائق ہو جاتا ہے۔

محمد بن مسلمؒ کی روایت سے اس پر کافی روشنی پڑتی ہے "فِی الصَّبِیِّ مَتٰی یُصَلِّی" بچہ کے بارے میں امام سے دریافت کیا کہ اسے کب نماز پڑھنا چاہیئے۔ فرمایا "اِذَا عَقَلَ الصَّلٰوۃَ" جب وہ نماز کو سمجھنے لگے" پوچھا "مَتٰی یَعْقِلُ الصَّلٰوۃَ وَتَجِبُ عَلَیْہِ" کب نماز کو سمجھنے لگتا ہے اور نماز اس کے لئے ثابت ہوتی ہے؟" حضرت نے فرمایا "چھ برس کے سن میں"

معلوم ہوتا ہے کہ معیار اس کا یہ ہے کہ بچہ میں عقل و شعور پیدا ہو جائے۔ امام جعفر صادقؑ کی حدیث ہے:۔ "اِذَا اَتٰی عَلَی الصَّبِیِّ سِتُّ سِنِیْنَ وَجَبَ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَاِذَا اَطَاقَ الصَّوْمَ وَجَبَ عَلَیْہِ الصِّیَامُ" جب بچہ کا چھ برس کا سن ہو تو نماز کا حکم اُس کے

لئے ثابت ہے اور جب روزہ کی طاقت ہو تو روزہ رکھنے کا حکم ہے"

گزشتہ روایت میں راوی کے سوال میں اور اس حدیث میں امام کے جواب میں "وجوب" کی لفظ ہے۔ جس سے شبہ ہوتا ہے کہ وہ واجب ہے۔ مگر کلمات ائمہ کے تلاش و جستجو سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وجوب تحریم، استحباب، کراہت اور اباحت کے الفاظ اصطلاحی طور پر موجودہ معانی میں علم فقہ کی تدوین کے ساتھ فقہا کے درمیان قرار پاتے ہیں۔ اس کے پہلے قرآن و حدیث میں زیادہ تر یہ لغوی معنی کی حیثیت سے استعمال ہوتے تھے۔ اس لئے واجب کی تعبیر مستحب سے اور مستحب کی تعبیر واجب سے۔ اسی طرح حرام و مکروہ کے الفاظ میں ایک کا دوسرے میں استعمال کثرت سے ہوتا ہے۔ یہ قرائن مقام اور ادلّہ خارجیہ سے وابستہ ہے کہ اصطلاحی حیثیت سے وجوب یا استحباب کا پتہ چلے۔

چونکہ متواتر احادیث اس امر کے ثبوت میں موجود ہیں کہ بچہ جب تک بالغ نہ ہو اس وقت تک "تکالیف شرعیہ اس سے متعلق نہیں ہوتے اور بلوغ کی حد بھی مقرر کر دی گئی ہے کہ وہ پندرہ برس ہے اس لئے ان احادیث میں مراد استحباب ہے۔ اگرچہ اس کو کہیں وجوب کی لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

امام محمد باقرؑ کی حدیث میں ہے: "اِنَّا نَاْمُرُ صِبْیَانَنَا بِالصَّلٰوۃِ اِذَا کَانُوْا بَنِیْ خَمْسِ سِنِیْنَ فَمُرُوْا صِبْیَانَکُمْ بِالصَّلٰوۃِ اِذَا کَانُوْا بَنِیْ سَبْعِ سِنِیْنَ

ارشاد ہوتا ہے کہ "ہم لوگ (اہلبیت معصومینؑ) اپنے بچوں کو
نماز پڑھنے پر مامور کرتے ہیں جب وہ پانچ برس کے ہوں
لہٰذا تم لوگ (کم از کم) اپنے بچوں کو نماز کے لئے مامور
کرو جب وہ سات برس کے ہوں"

یہ اس اصول پر مبنی ہے کہ جو رہنمایان مذہب ہوں ان کو ضرورت
ہے کہ مذہبی احکام کی طرف توجہ اس سے زیادہ کریں، جتنا
کہ عام لوگوں کو وہ دعوت دیتے ہیں۔

اس حدیث کا لب ولہجہ استحباب کو صاف بتلاتا ہے۔ اس لئے
کہ واجبات میں شرع کی جانب سے تعبدی پابندی ہوتی ہے
اور وہ سب کے لئے عمومیت رکھتی ہے۔

یہ تفریق اور اس طرح اپنے بیاں کی مثال پیش کر کے دعوت
عمل دینا استحباب کے لئے زیادہ مناسب ہے۔

اب اختلاف ہے علماء میں کہ یہ بچہ جو نماز روزے وغیرہ ادا کرتا
ہے یہ عبادت کی حیثیت رکھتے ہیں یعنی اس کو ثواب بھی اُن اعمال کا
حاصل ہوگا یا صرف تمرینی حیثیت رکھتے ہیں۔ یعنی مشق کے لئے انجام
دیئے جاتے ہیں۔ اسی بناء پر یہ عام طور سے مشہور ہوگیا ہے
کہ بچہ جو نماز پڑھتا ہے اس کا ثواب اسے نہیں ہوتا بلکہ
والدین کو ہوتا ہے۔

اس کی بنیاد اسی امر پر ہے کہ جب وہ کوئی عبادت نہیں اور صرف مشق ہے تو یہ

ظاہر ہے کہ مشق کرانے کا تعلق ماں باپ سے ہے۔ لہٰذا اُن ہی کو
اُس کا ثواب بھی ہے۔

میری نظر میں اس مسئلہ میں کلیہ طور پر کوئی فیصلہ کرنا صحیح نہیں
ہے بلکہ اس کی صورتیں مختلف ہوتی ہیں۔

ایک صورت تو یہ ہے کہ بچہ کو اتنا احساس ابھی پیدا نہیں ہوا ہے
کہ وہ نماز کو ایک خداوندی حکم کے قصد سے انجام دے لیکن والدین
عبادت کا شوق پیدا کرنے کیلئے اس کو نماز پڑھنے کی ہدایت کریں
یا وہ ایک شریر اور بدطینت لڑکا ہے کہ وہ باوجود یہ سمجھنے کے
کہ یہ ایک حکمِ خدا ہے اور اچھی بات ہے۔ لیکن پھر بھی اگر والدین
اُس کو مجبور نہ کریں تو وہ نماز نہ پڑھے گا۔ وہ نماز پڑھتا ہے
صرف ماں باپ کی زبردستی سے اور اُن کے ڈر کے مارے
اور اس لئے وہ اکثر ماں باپ کو فقرہ میں بھی لے لیتا ہے
اور نماز کو اڑا دیتا ہے، ایسی صورت میں بے شک یہ
عمل عبادت نہیں ہے۔ اس لئے کہ قصد قربت جو عبادت
کا حقیقی جوہر ہے وہ اُس میں موجود نہیں، ایسا عمل اگر
کوئی بالغ و عاقل انسان کرے تو وہ بھی قابل قبول نہ
ہوگا۔ اس عمل کے ادا کرنے کا سہرا صرف ماں باپ کے
سر ہے جو عادت ڈالنے کیلئے بچہ کو اس کے ادا کرنے پر مجبور کرتے ہیں
وہ یقیناً اُسکی آئندہ زندگی کیلئے مفید ہے اس لئے کہ اس ذریعہ سے

ممکن ہے ایک وقت میں اس کو احساس فرض بھی پیدا ہو جائے۔ اور وہ صحیح طریقہ سے عبادت کو بجالانے لگے۔ اس لئے اس وقت نماز و روزہ کے ادا کرنے کا ثواب ان ہی ماں باپ کو ملنا چاہئے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ بچہ میں خود ذوق عبادت ہے اور اسے شوق ہے کہ وہ اس عمل کو جو خدا کی جانب سے اس کے بندوں پر عاید ہے بجالائے۔ یہاں تک کہ ممکن ہے کسی وقت والدین روکتے بھی ہوں کہ روزہ نہ رکھو یا نماز نہ پڑھو تو وہ بچہ نہیں مانتا اور اسے اضطراب پیدا ہوتا ہے کہ کسی طرح وہ اس عبادت کو انجام دے لے۔ ایسے بچے یقیناً جو اعمال بجا لائیں ان کے ثواب کا انہیں استحقاق ہے۔ بلوغ کا زمانہ مقرر کیا جانا ایک تفضّل ہے خداوند عالم کی جانب سے جس کی بنا پر پندرہ برس تک انسان فرائض الٰہیہ سے سبکدوش رکھا گیا ہے۔ ورنہ عقلی حیثیت سے اکثر بچے اس کے بہت پہلے اس قابل ہو جاتے ہیں کہ ان پر پابندیاں عاید کی جاسکیں پندرہ برس تک آزاد رکھنا صرف احسان ہے اور کچھ نہیں لیکن تفضّل واحسان اسی وقت تک تفضّل ہے۔ جب تک وہ کسی حیثیت سے خلاف تفضّل نہ ہو۔ احسان کا تقاضا صرف یہ ہے۔ کہ بلوغ کے پہلے انسان کو گناہوں کی سزا سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ لیکن اگر وہ عبادت واطاعت کی حقیقت کا صحیح احساس رکھتے ہیں اور اس کے برکات سے مستفید ہونا چاہتے ہیں تو انہیں ان

برکات سے محروم کرنا اور اس کے اجر وثواب سے بے بہرہ رکھنا بالکل تفضّل و احسان کے خلاف ہے۔

بچوں کے مرفوع القلم ہونے کے نصوص ہرگز اس کو نہیں بتلاتے بے شک اس صورت میں اگر ماں باپ ترغیب عبادت و اطاعت کرتے ہیں اور ان کی ترغیب وتحریص سے بچہ میں جذبۂ طاعت وعمل پیدا ہوتا ہے تو اس کے ثواب کا جس طرح بچہ کو بحیثیت عمل حاصل ہونے کے استحقاق ہے۔ اسی طرح ان ماں باپ کو بحیثیت محرک عمل حاصل ہونا چاہئے۔ جس طرح اگر کسی سمجھ دار اور سن رسیدہ شخص کو دعوتِ عبادت و اطاعت دی جائے تو عامل کو ثواب عمل کا ہے اور محرک کو تحریک عمل کا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ واجبات کے وجوب سے بچے مستثنیٰ ہیں لیکن استحباب کا درجہ ان کے لئے ثابت ہے اور اس لئے مستحبات جو عام اشخاص کے لئے ہیں وہ بچوں کے لئے بھی ہیں اور ان سے بچوں کے مستثنیٰ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

لڑکیوں کی تربیت کے خاص اصُول

بچوں کی تعلیم و تربیت میں جس اصول کے ماتحت ان کو عبادات و اطاعات کی عادت ڈالنے کا حکم ہے اس اصول پر لڑکیوں کی تربیت

میں کچھ باتوں پر خاص طور سے توجہ کرنے کی ضرورت ہے جو انکی اخلاقی اصلاح کے لئے انتہائی ضروری ہیں۔ لڑکیوں کو ان کے آئندہ دور میں ایک خاص طرح کی زندگی بسر کرنا ہے اور شریعت اسلامی کے احکام کے ماتحت ان کے لئے پردہ فرض و لازم ہوگا۔ اس لئے ان کو کمسنی کے زمانہ سے پردہ کی پابندی کے لئے تیار کیا جائے ان گھرانوں کا ذکر نہیں اور ان افراد سے بحث نہیں جن کے یہاں اب عورتوں کے لئے پردہ کوئی چیز ہی نہیں رہا ہے۔ مگر وہ شریف گھرانے جہاں اب بھی پردہ کی کوئی اہمیت باقی ہے ان کو اس امر کا خیال رکھنے کی ضرورت ہے کہ لڑکیوں کو بچپنے کے دور میں اس طرح آزاد نہ رکھا جائے۔ جس طرح لڑکے آزاد رہتے ہیں،

اکثر دیکھا گیا ہے کہ لڑکیوں کو بلوغ کے زمانہ تک باہر نکلنے اور لڑکوں کے ساتھ کھیلنے کی اجازت رہتی ہے۔ بلکہ کبھی شرعی سن بلوغ کا یعنی ۹ برس پورے بھی ہو جاتے ہیں مگر اسے ابھی بچہ سمجھا جاتا ہے۔ اور پردہ کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا ہے۔ ان لوگوں کو یہ سمجھنا چاہئیے کہ لڑکی ایک انسانی مخلوق ہے اور کمزور۔ اس کی طبیعت میں متاثر ہونے کا کافی مادہ موجود ہے۔ اگر بچپنے میں اسے تفریح گاہوں میں جانے کا ذوق، باغات کی سیر کا شوق اور تماشا گاہ عالم کے مناظر دیکھنے کا لطف حاصل ہو گیا۔ تو

بلوغ یا بقول آپ کے جوانی کا زمانہ آتے ہی اس کو ایک دم پابند بنانا اور پردہ کے اندر مقید کرنا اس کی فطرت کے اوپر ایک ایسا زبردست دباؤ ہوگا جسے وہ مشکل سے برداشت کر سکے گی اگر واقعی آپ کو اسے آئندہ زمانہ میں پردہ کرانا ہے تو اس کے لئے آپ کو پہلے سے اس کی طبیعت کو عادی کرنا چاہئیے۔ اس کی صورت یہی ہے کہ اس وقت کا ذکر نہیں۔ جب اس میں سمجھنے کی کچھ صلاحیت ہی نہیں ہوتی۔ لیکن جب سے اس میں امتیاز و شعور پیدا ہو اسی وقت سے اسے یہ احساس پیدا کرائیے کہ وہ "لڑکی" ہے۔ اور لڑکی کی طرح اسے رہنا چاہئیے۔ اس میں ایک حکیمانہ تدریج قائم کرنا چاہئیے۔ اور جب وہ چھ سات برس کی ہو تو اسے مکمل پردہ کا عادی بنا دینا چاہئیے۔ اس طرح نہیں کہ اس کی طبیعت کے لئے یہ ناگوار ہو۔ بلکہ اس طرح کہ وہ خود سمجھے کہ میرے لئے موزوں و مناسب یہی طریقہ ہے یوں سمجھئے کہ اس کی طبیعت کو اس سانچہ میں ڈھالنا چاہئیے کہ اسے ذوق ہی "سیر و تماشا" کا پیدا نہ ہو۔ اجنبی لڑکوں کے ساتھ سمجھدار لڑکیوں کا کھیلنے دینا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ وہ بچپنے کے ساتھ کھیلنے ہی کا انس و محبت ایک وقت میں دوسری شکل اختیار کر سکتا ہے جس پر والدین کو شرمساری و پشیمانی کا موقع حاصل ہوگا۔

اکثر بچوں سے جو کہانیاں کہی جاتی ہیں ان میں عشق و محبت کے تذکرے

ہوتے ہیں یہ چیز لڑکیوں کے لئے خاص طور سے مضر ہے۔

اُن سے جو کہانیاں کہی جاتی ہیں ان میں اگر سچائی، دیانتداری، امانت
وغیرہ کے سبق حاصل ہوتے ہوں تو بہت اچھا ہے اور نہیں تو کم سے کم
ایسی باتیں تو نہ ہونا چاہیئے جو اُن کے دماغ کو نامناسب خیالات کا مرکز
قرار دے سکتی ہیں۔ میں تو لڑکیوں سے ایسی کہانیاں کہنے کا بھی حامی نہیں
ہوں۔ جن میں عفت و پارسائی کا تذکرہ ہو۔ جیسے بادشاہ اور قاضی اور
اس کی زوجہ کی حکایت جو اکثر قدیم اخلاق کی کتابوں میں درج ہے
اور شعراء نے اسے نظم بھی کیا ہے۔ کیونکہ اسطرح کے حکایات میں بھی
صنفی تعلقات کی اسی طرح یاد دہانی ضرور موجود ہے۔ جس سے
میری رائے میں ابتدائے عمر میں لڑکیوں کو بالکل خالی الذہن
ہی رہنا بہتر ہے۔ چہ جائیکہ وہ حکایتیں جن میں ناجائز تعلقات
اور ہجر و وصل کے افسانوں کا بیان ہو۔

میری نظر میں لڑکیوں کی تربیت کا جو معیار ہے وہ تو اتنا
دشوار ہے کہ غالباً موجودہ نظام معاشرت میں اس پر عمل ہونا
بالکل غیر ممکن ہے۔

لڑکی کے سامنے زیادہ شادی کا ذکر کرنا جیسے اکثر دلچسپی کے طور
پر اسکے گھونگٹ نکال دیتے ہیں۔ کہتے ہیں لو دلہن بیٹھی ہے یا اسکو شرمانے
کے لئے خواہ مخواہ اس کے سامنے شادی کا نام لیتے ہیں، یہ چیزیں وہ
ہیں جو اس کے ذہن میں یہ تصور پیدا کرتی ہیں کہ شادی ایک خاص

چیز ہے جس میں کچھ مخصوص لطف مضمر ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ
وہ اس وقت کا انتظار کرنے لگتی ہے اور اس کے بعد اگر
اس میں تاخیر ہونے لگتی ہے۔ تو اس کا نتیجہ کچھ اچھا نہیں ہوسکتا۔
ایک صاف سادہ مخلوق جس میں تشنگی موجود نہیں اسے صرف
خوش آیند تذکروں سے تشنہ بنایا جاتا ہے۔ پھر جس وقت اس کو سچی
پیاس ہو گی تو آپ اس کے حصول مقصد میں تاخیر بھی کریں گے
یقیناً اس میں جو کچھ بھی بُرے نتائج پیدا ہو جائیں وہ کم ہیں۔

بعض چیزیں ایسی ہیں کہ جن سے بالواسطہ شادی کی آرزو کا
استحکام ہوتا ہے۔ حالانکہ اُن کے قرار دینے کا مقصد نیک
تھا۔ مگر طریقۂ حصول اس کا میرے نزدیک اچھا نہیں اختیار کیا گیا۔

اکثر گھرانوں میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو غیر شادی
شدہ لڑکیوں کے لئے ممنوع ہیں۔ جیسے مسّی لگانا۔ اُلٹے
بال بنانا۔ عطر لگانا۔ ہار پھول پہننا۔ پائنچے دار پائجامہ
پہننا وغیرہ وغیرہ۔ جب لڑکی ان باتوں کا ارادہ کرتی
ہے تو اُسے یہ کہکر روک دیا جاتا ہے۔ کہ تمہاری شادی
نہیں ہوئی ہے۔ تم کو یہ باتیں نہیں کرنا چاہئیں۔ اس
کا نتیجہ ہے کہ لڑکی کو شادی کی حسرت پیدا ہو جاتی
ہے۔ نہ یہ کہ وہ شادی کی اصل حقیقت سے واقف
ہے۔ بلکہ اس لئے کہ شادی ہو۔ تو ہمیں بھی یہ

آرائشیں کرنے کی اجازت ملے۔ میں نے کہا کہ اس رسم کا
مقصد نیک تھا، درحقیقت اس رسم کی بنیاد اس خیال پر تھی
کہ آرائش حُسن خود طالبِ اظہار ہے۔ اگر لڑکی آراستہ و پیراستہ
ہو گی تو خود بخود اس کے ذہن میں اس قسم کا خیال پیدا ہوگا کہ
اس کو دیکھنے والا ہونا چاہیئے۔ لیکن اگر وہ بچی کھچی رہے
آرائش سے علیحدہ رہے تو اس کے ذہن میں یہ خیال پیدا
ہی نہیں ہوگا۔ لیکن اس مقصد کے لیئے ضرورت تھی
ایسے طریقوں کی کہ لڑکی کے دل میں شوق آرائش پیدا ہی نہ ہو
اصول تربیت کے تحت میں اس کا صحیح طریقہ یہ تھا کہ جب سے
لڑکی ذرا سمجھدار ہو تو اس کی ماں، بڑی بہنیں اور دوسری بزرگ عورتیں
جو گھر میں رہتی ہوں وہ خود اپنی آرائش کو کم کر دیں، تاکہ لڑکی بھی ایسی
ماحول میں پرورش پائے۔ یہ نہیں کہ جب کسی تقریب میں
جانے لگے تو جتنی گھر کی عورتیں ہیں سب نے بہترین طریقہ سے
اپنے تئیں آراستہ کیا۔ اور رونق حسن کے جتنے اسباب ہیں
سب مہیا کر لئے ہیں۔ صرف ایک یہ "گنہگار" بن بیاہی
لڑکی رہ گئی جو سب سے علیحدہ وضع رکھتی ہے۔ یہ چاہتی ہے
کہ اُسی طرح یہ بھی آراستہ ہو تو یہ کہدیا جاتا ہے کہ نہیں۔ خبردار تمہاری
ابھی شادی نہیں ہوئی ہے۔ تم کو حق نہیں اب نہ پوچھیئے کہ اُس کے
دل پر کیا گزرے گی اور اُسے کس طرح اپنی دوسری ساتھی عورتوں

پر رشک آئے گا اور اس طرح یہ خواہ مخواہ شادی کے وقت
کی منتظر بن جائے گی ؛

یہ کچھ بُرا نہ تھا اگر آپ اس معاملہ میں شرع کے حکم پر چلتے
کہ وہاں یہ حکم ہے کہ لڑکی کی شادی بہت جلدی کرو۔ یہاں تک
کہ اگر اُس کا بلوغ ہی شوہر کے گھر میں ہو تو بہت اچھا ہے مگر
یہاں تو لڑکیاں اکثر بیس۲۰ پچیس۲۵ برس تک بٹھا رکھی جاتی ہیں
اس لیئے کہ آپ کی طبیعت کے مطابق شوہر نہیں ملتا۔ اور
اکثر لڑکیوں کی "بہار زندگی" اسی طرح "خزاں" ہو جاتی ہے
اور وہ حقیقی طور پر زندہ در گور ہو جاتی ہیں۔ اس طرزِ عمل کے
ساتھ پھر وہ طریقۂ تربیت تو انتہائی مہلک اور ضرر رساں ہے
اور کیا معلوم کہ جو ناگوار واقعات پیش آتے ہیں۔ اُن میں
کہاں کہاں والدین ہی کا طرزِ عمل سبب ہوتا ہے۔ جو خراب
صورتیں پیش آتی ہیں ؛

زمانۂ بلوغ

یا

انسانی ذمہ داری کا ہنگام

بچہ کی صحیح تعلیم و تربیت ہو چکی، اسے ضروری تعلیم دے دی گئی

اس کے اخلاق کی اصلاح کی گئی، اس کو عبادت و اطاعت کا ذوق و
شوق پیدا کیا گیا اور لڑکیوں کو مناسب طریقہ پر اُن کے آئینِ زندگی
کا پابند بنا دیا گیا۔ مگر ابھی تک نابالغی کا زمانہ ہے۔ اس وقت
میں ایک طرف وہ تکالیف سے مستثنیٰ ہیں یعنی گناہ اُن
کے نامۂ عمل میں نہیں لکھے جاتے اگرچہ ثواب کے متعلق
میں نے کہا کہ اگر ان میں خود ذوقِ عبادت و اطاعت پیدا
ہو گیا ہے تو انہیں استحقاق حاصل ہے۔ ثواب و عذاب
کے مسئلہ میں اس تفریق کا مجھے ایک شاہد احادیث میں بھی مل گیا
امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں۔ اِنَّ اَوْلَادَ الْمُسْلِمِیْنَ مَوْسُوْمُوْنَ عِنْدَ اللہِ
شَافِعٌ مُشَفَّعٌ فَاِذَا بَلَغُوْا اِثْنَتَیْ عَشَرَۃَ سَنَۃً کُتِبَتْ لَھُمُ الْحَسَنَاتُ فَاِذَا
بَلَغُوْا الْحُلُمَ کُتِبَتْ عَلَیْھِمُ السَّیِّئَاتُ" مسلمانوں کی اولاد خدا کے یہاں
نامزد ہے۔ وہ اپنے والدین کی شفاعت کرنے والے ہیں اور وہ شفیع
قرار دیئے گئے ہیں اس کے بعد جب ۱۲ برس کی عمر ہو تو اُن کے
لئے نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور جب بالغ ہوں تو گناہ لکھے جاتے ہیں"
اس میں جو عمر مقرر کی گئی ہے وہ ویسی ہی جیسے تعلیم و
تادیب کے لئے سات برس کی جس کو میں نے کہا کہ یقینی
حیثیت نہیں رکھتی بلکہ ایک تخمینہ ہے۔ اسی طرح یہ زمانہ مطلب
یہ ہے کہ شروع میں چھ سات برس کے سن میں جب سے کہ تعلیم و تربیت
اور عبادتوں کی عادت ڈالنے کا حکم ہوا اس وقت ان میں زیادہ تر وہ

خیالات دماغ میں راسخ نہیں ہوتے اور نہ ان کا عقل و شعور اور علم و
معرفت اتنا ہوتا ہے کہ وہ عبادت کو عبادت سمجھ کے بجا لائیں۔ اس
لئے جس طرح گناہ ان پر نہیں ہیں، اسی طرح ثواب بھی ان کے لئے
نہیں ہے۔ لیکن اس کے بعد کچھ مدت میں وہ زمانہ آجاتا ہے
جب وہ عبادت کو بطور عبادت بجا لا سکتے ہیں۔ یہ ابتدائے تعلیم
کے سن یعنی چھ یا سات برس کی عمر اور وقت بلوغ یعنی پندرہ
برس کے درمیان کی ایک منزل ہے۔ اس لئے اس کے لئے
۱۲ برس کی عمر تخمینہ کے طور پر بتلائی گئی۔

اس زمانۂ نابالغی میں جس طرح واجبات و محرمات کی ذمہ داری
سے وہ سبکدوش ہیں۔ اس لئے کہ ان کی عقل ابھی کامل نہیں ہوئی
ہے۔ اس کے علاوہ ان کے اموال اور ملکیتوں میں ان کے تصرفات
بھی نافذ نہیں ہیں۔ ملکیت کا حصول تو بلوغ پر موقوف نہیں ہے
شیر خوار بچہ، بلکہ جب وہ حمل کی حالت میں تھا اس کے لئے بھی
ملکیت کا حصول ممکن نہ تھا۔ مثلاً اگر کوئی اس کا عزیز قریب مر
جائے جس کی میراث کا اسے حق حاصل ہے تو اس کا حصہ الگ
کیا جائے گا۔ جب وہ زندہ پیدا ہو تو اس کے لئے وہ میراث قرار
دی جائے گی۔ مگر تصرف املاک میں اس وقت تک صحیح نہیں جب تک
حدِ بلوغ تک نہ پہنچ جائیں۔ یہ بھی ان ہی کے مفاد کی خاطر ہے۔ اس لئے
کہ ناسمجھی اور بھولے پن سے نہ معلوم کون سا ایسا تصرف کر دیں۔ جو

اُن کے حق میں مُضر ہے۔ جس پر کہ بعد میں اُنہیں دستِ تاسف ملنا پڑے علاوہ مالی تصرفات کے دوسرے ان کے معاملات جیسے نکاح وغیرہ بھی معتبر نہیں قرار دیئے گئے۔ بے شک ان تمام باتوں کے لئے ان کے واسطے ولی مقرر کر دیئے گئے وہ جو عام اصول فطرت کی بنا پر ان کے مفاد کی نگہداشت خود اُن سے زیادہ کر سکتے ہیں۔ یعنی باپ اور دادا، اس بارے میں ان کو یہ تاکید ہے کہ وہ بچہ کے مفاد کا خیال رکھیں۔ مگر اُن کو اس معاملہ میں ان کی عظمت کا لحاظ کرتے ہوئے ایک طرح کی حکومت دی گئی ہے۔ یعنی وہ اپنی صوابدید سے جو کام اس بچہ کے لئے کر دیں اُن کے منسوخ کرنے کا اس کو بلوغ کے بعد بھی حق نہیں ہے۔ ان دونوں میں سے ہر ایک مستقل طور پر ولی ہے۔ اگر دونوں موجود ہیں اور ایسا اتفاق ہو کہ دونوں متضاد تصرف واقع کریں۔ مثلاً ایک نے اس کی کسی املاک کو ایک کے ہاتھ فروخت کیا اور ناواقفیت کی وجہ سے دوسرے نے کسی اور کے ہاتھ تو جس کا تصرف پہلے واقع ہُوا ہو وہ نافذ سمجھا جائے گا۔ دوسرا تصرف بیکار ثابت ہوگا۔ اور اگر اتفاقی طور پر ایک ساتھ یہ تصرفات ہوں تو دادا کا حکم باپ پر مقدم ہے کیونکہ وہ اس کے لئے بھی واجب الاطاعت ہے ؁

بیشک طلاق کا مسئلہ اس درجہ شریعت نے نازک قرار دیا ہے کہ اُس کا حق شوہر کے سوا اور کسی کو نہیں ہے۔ اَلطَّلَاقُ بِیَدِ مَنْ اَخَذَ بِالسَّاقِ

"طلاق اسی کے ہاتھ میں ہے جو ہاتھ پکڑے گا" اس لئے باپ دادا بھی اپنی ولایت سے اگر بچہ کا عقد کریں تو پھر وہ اسے طلاق نہیں دے سکیں گے۔ نابالغی کے زمانہ ہی میں باپ کے اُٹھ جانے سے انسان یتیم ہوتا ہے۔ بلوغ کے بعد یتیمی کی حدیں ختم ہو جاتی ہیں اور پھر اسے یتیم نہیں کہا جا سکتا۔

بلوغ کے لئے شرع نے دو حیثیتوں سے حد مقرر کی ہے۔ ایک عمر کے لحاظ سے یعنی لڑکے کو پندرہ ۱۵ برس پورے ہو جائیں اور لڑکی کو نو ۹ برس۔ دوسرے حالات کے لحاظ سے مثلاً مرد اور عورت دونوں میں وہ صورتیں پیدا ہونا جن سے غسل واجب ہوتا ہے۔

یہ قابلِ غور بات ہے کہ بلوغ حکمِ شرعی ہے۔ جس کا نتیجہ ہے تکالیف شرعیہ کا متوجہ ہونا۔ اور تصرفات کا نافذ ہونا۔ اور یتیمی کا ختم ہونا۔ اس لئے کہ "احکام شرعیہ وجوب حرمت، استحباب، کراہت، اباحت ہی کو نہیں کہتے، یہ تو "احکام تکلیفیہ" ہیں۔ ان کے علاوہ شرعی احکام بہت ہیں۔ جیسے طہارت، نجاست، زوجیت، ملکیت، حریت وغیرہ وغیرہ۔ ان کو احکام وضعیہ کہتے ہیں۔ یہ بھی شرع ہی کی طرف سے مقرر ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہا جائے کہ بلوغ بھی اسی طرح کا ایک شرعی حکم ہے۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ اسکا اختیار بالکل شرع کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جس چیز کو چاہے اس حکم کا محل قرار دے سکتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ

سے احکام مرتب ہوئے
وہ ایک امر واقعی ہے۔ جس پر شرع کی طرف
ہیں اور ان حالات کا پیدا ہونا اس کے حصول کی علامت ہے
اس وقت میں یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ شرع کی جانب سے
اس کے لئے دو حدیں مقرر کیا جانا کیونکر درست ہیں۔ جبکہ وہ دونوں
بالکل لازم اور ملزوم نہیں ہیں۔ بلکہ ایک دوسرے سے جدا بھی ہو جاتی
ہیں۔ اس کے علاوہ آب و ہوا، مزاج وغیرہ کے اعتبار سے بچہ کے
خصوصیات مختلف ہوتے ہیں، کسی میں چودہ[۱۴] برس کے سن میں وہ
حالت پیدا ہو جاتی ہے جو دوسرے میں پندرہ[۱۵] برس کے سن میں
ہوتی ہے اور کسی میں سولہ[۱۶] برس کی عمر میں بھی یہ حالت نہیں
ہوتی۔ اس صورت میں شارع کی جانب سے سب کے لئے
ایک عمر مقرر ہو جانا کہاں تک درست ہے۔

اس کا جواب میں اس طرح پیش کروں گا کہ کوئی حکم جو
دیا جاتا ہے اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی شخص
خاص مخاطب ہو اور اس کے خصوصی حالات کی بنا پر اُس کے
ذمہ کوئی فرض عائد کیا جائے ظاہر ہے کہ اس صورت میں تو
اس کے خصوصیات اور انفرادی حالات اس حکم کا معیار
ہوں گے اور وہ بالکل معین حیثیت رکھتے ہوں گے۔ اسی طرح اگر چند
اشخاص کی جانب حکم متوجہ کیا جائے مگر ان کی انفرادی خصوصیتوں کے
لحاظ کے ساتھ یقیناً اس صورت میں لازمی ہے کہ اگر ان کے حالات

یکساں ہوں تو ایک حکم سب کیلئے جاری کیا جائے اور اگر حالات ان کے
مختلف ہوں تو ہر ایک کیلئے اس کے لحاظ سے حکم ہو، اور سب کے حکم
جدا جدا ہوں۔ لیکن دوسری صورت یہ ہے کہ ایک عام قانون نافذ کرنا
مقصود ہے جس میں افراد و اشخاص کی خصوصیت کا کوئی سوال ہی نہیں ہے
اس صورت میں اگر ان کے حالات باہم اختلاف رکھتے ہیں تو ان سب کی
اجتماعی حیثیت کو سامنے رکھ کر ایک غالبی معیار یا اوسط نکالا جائیگا
اور اس کے مطابق حکم نافذ کیا جائے گا اس میں پھر یہ سوال ہی پیدا
نہیں ہو سکتا کہ کسی فرد میں یہ صورت پہلے ہو جاتی ہے اور کسی میں بعد۔ مثال
کے طور پر گورنمنٹ کی جانب سے زمینداریوں وغیرہ کے تعلیقہ میں بائیس[۲۲]
برس کی عمر معین کی گئی ہے ظاہر ہے کہ اس کے لئے کوئی نہ کوئی معیار اور
اصول پیش نظر ضرور تھا۔ یعنی ۲۲ کی تعداد سے کوئی خاص محبت نہیں
تھی۔ نہ اس عدد سے کوئی برکت حاصل کرنا مقصود تھی۔ مگر
یہ یقینی ہے کہ وہ معیار و اصول ہر ایک شخص کے لئے ٹھیک
ٹھیک بائیس ہی برس میں حاصل نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ کسی کے لئے
پہلے ہوتا ہے کسی کے لئے بعد۔ لیکن پھر بھی قانونی حیثیت سے
عموم پیدا کرنے کے لئے ایک عمر کا سب کے لئے معین کرنا ضروری
سمجھا گیا۔ اسی طرح ساردا ایکٹ میں شادی کے لئے جو ۱۶ اور ۱۸
برس کی عمر معین کی گئی ہے وہ چاہے ہمارے نزدیک غلط ہو
لیکن پھر بھی کسی نہ کسی مفروضہ معیار کی بنا پر رکھی گئی ہے۔ وہ

معیار یقیناً اتنی ہی عمر پر بالکل منطبق نہیں ہے۔ مگر قانون کا اندازہ ہی یہ
ہوتا ہے کہ اس میں انفرادی اختلافات اثر انداز نہ ہوسکیں
اب ملاحظہ کیجیے کہ وہ حالات جو اصل میں علامات بلوغ مقرر کئے
گئے ہیں چونکہ باطنی چیز ہیں اور اکثر ایسے ہیں کہ جب تک خود انسان ان کا
اظہار نہ کرے اس وقت تک ان کا علم ممکن نہیں، اگر ان ہی کو معیار بلوغ
قرار دیا جاتا تو لیا اوقات اس میں اشتباہ واقع ہوتا نیز اکثر عوارض کی بنا پر
وہ حالات پیدا نہیں ہوتے یا بہت زیادہ عمر میں پیدا ہوتے ہیں۔ اسلئے
ضرورت تھی کہ ان کے علاوہ بھی کوئی معیار مقرر کیا جائے جس کا سمجھنا آسان
ہو۔ اس کیلئے عمر قرار دی گئی اب اگر ان دوسرے حالات کا علم اس عمر
کے پہلے ہی ہو جائے تو وہی ثبوت بلوغ کے لئے کافی ہوں گے
اور اگر یہ عمر حاصل ہو گئی تو چاہے وہ حالات پیدا ہوں یا نہ ہوں
بلوغ شرعی حاصل ہو جائیگا اور احکام بلوغ مترتب ہوں گے۔

بلوغ کے بعد کی اہم ذمّہ داریاں

حدِ بلوغ تک پہنچنے کے بعد انسان کی ذمہ داریاں بہت ہیں
جن کو دو شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے (ایک) اصول عقائد (دوسرے)
عملی فرائض۔ اس دوسرے شعبہ میں پھر دو قسمیں ہیں ایک حقوق اللہ
یعنی انسان کے انفرادی فرائض دوسرے حقوق الناس یعنی اجتماعی فرائض
ان پر ترتیب کے ساتھ روشنی ڈالی جاتی ہے۔

نظامِ زندگی میں مذہب کی اہمیّت

انسانی زندگی میں عقائد کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مذہب ہی
وہ ہے جو دنیا میں امن و امان کا سبب ہو سکتا ہے، اور مختلف
جماعتوں میں حقوق و حدود کی تعیین کرتا ہے۔
بات یہ ہے کہ ہر انسان بلندی و تفوق کا طالب ہے اور اپنی
خواہشوں کو حاصل کرنا چاہتا ہے اور ہر انسان کی خواہشیں ہیں لامحدود
یہاں تک کہ اگر ایک انسان کو تمام دنیا بھی مل جائے تو وہ آرزومند ہوگا
کہ ایک دنیا دوسری ہو۔ جسے وہ اپنے قبضہ میں لائے مگر دنیا اور اسکے
منافع ہیں محدود اس لئے اگر ایک انسان کو سب کچھ وہ دے دیا جائے
کہ جس کا وہ طالب ہے تو دوسرے سب کو محروم ہونا پڑیگا اور اگر
سب کو ان کی لامحدود خواہشوں کے حاصل کرنے کیلئے آزاد چھوڑ دیا جائے
تو تصادم ہوگا اور قوتوں کا تقابل ہوگا۔ جس میں ہر طاقتور کمزور کو فنا کر دینے
کی کوشش کریگا۔ پھر اگر یہ قوت اور کمزوری کوئی مستقل اور دائمی حیثیت
رکھتی ہوتی تو اچھا ہوتا کہ ایک دفعہ مقابلہ ہو کر فیصلہ ہو جاتا۔ جو طاقتور
ہوتا وہ زندہ رہتا اور جو کمزور ہوتا وہ فنا ہو جاتا مگر یہ دنیا کی طاقت و
قوت اور کمزوری ہوا کے جھونکوں اور جھولے کے پینگوں کی طرح
منتقل ہوتی رہتی ہے۔ ایک وقت جو طاقتور ہے وہ دوسرے وقت
کمزور اور ایک وقت جو کمزور ہے وہ دوسرے وقت طاقتور ہوتا ہے

اب جس شخص نے اپنی قوت کے موقع پر دوسرے کمزور پر زیادتی کی وہ
اس کمزور کے دل میں رہ جاتی ہے اور وہ موقع کا منتظر رہتا ہے جب
اس کو طاقت حاصل ہوتی ہے تو وہ اس کا بدلا لیتا ہے۔
مثال کے طور پر ایک توانا وتندرست جوان اپنے راستے میں ایک
کمزور اور ناتوان بچے کو دیکھتا اور اسے دھکا دیکر ہٹا دیتا ہے۔
یہ اسوقت ایک بالکل معمولی چیز تھی اور اس کے لئے آسان مگر
یاد رکھنا چاہئے کہ ایک وقت میں یہ جوان بوڑھا ہوگا اور وہ بچہ جوان
ہوگا، اگر اس نے یہ احساس دلمیں قائم رکھا کہ میری کمزوری سے
فائدہ اٹھا کر اس شخص نے مجھ پر زیادتی کی تھی تو وہ اپنی قوت کے دور
میں اس شخص سے بدلا لینے کی کوشش کریگا۔ اب ممکن ہے کہ وہ بوڑھا
آدمی چیخے چلائے۔ اور فریاد بھی کرے کہ میں مظلوم ہوں یہ جوان آدمی
مجھے مارے ڈالتا ہے اور ناواقف یا سادہ لوح افراد اس سے متاثر
بھی ہوں مگر حقیقت میں یہ اس کی مظلومیت ایک وقت کے ظالم ہونے
کا نتیجہ ہے۔ دنیا میں اس طرح کی مثالیں پیش ہوتی رہتی ہیں جس وقت
حالات آپ کے سازگار تھے اور طاقت آپ کے ساتھ تو دشمن کو کمزور
پاکر آپ نے معاہدہ کے شکنجے میں اُس کو اسیر کرکے اس کے مقبوضات
مال لاوارث کی طرح اپنے دوستوں پر تقسیم کر دیئے لیکن جب دشمن زمانہ
کی مہلت پاکر اپنی طاقت کو بڑھا کر اپنے سابقہ مقبوضات کا مطالبہ کرتا ہے
اور ممکن ہے کہ اس کے ساتھ جذبۂ انتقام کی بناء پر اپنے حریفوں کے اوپر

کچھ زیادتی بھی کر رہا ہو تو آپ فریاد کرتے ہیں کہ ہم پر ظلم ہو رہا ہے
ہم مظلوم ہیں اور ہمدردی کے مستحق ہیں اور دنیا بھی کہتی ہے کہ ہاں
بے شک مظلوم ہیں۔
بات یہ ہے کہ انسان حال کو دیکھتا ہے اور وہی اس کے
دل ودماغ ڈالتا ہے اور ماضی ومستقبل چونکہ نگاہ سے اوجھل
ہیں، اس لئے ان کا اثر پڑتا نہیں۔
اس وقت جس کی زیادتی ہوگی دنیا کے زود فراموش افراد اسی کو
کہیں گے کہ ظالم ہے۔ حالانکہ یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس ظلم کے اسباب
کیا ہیں۔ پھر اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے انداز مختلف ہوتے ہیں کوئی
تو شمشیر برہنہ ہوکر سامنے آجاتا ہے اور کوئی "دشنہ زیر آستیں نہاں"
کئے ہوئے اپنے حریفوں کے سامنے آتا ہے۔ بہرحال مختلف جماعتوں کی
خودغرضی اور تفوق وبرتری کی خواہش اور اپنے حقوق کا مطالبہ ہمیشہ
تصادم اور کشمکش کا باعث رہا ہے۔ اور رہے گا کیونکہ انسانی خیال
کے مطابق اس کے حقوق بھی اس کی تمناؤں کے ساتھ وابستہ ہیں جو جس
کی آرزو ہے اسی کو وہ اپنا حق سمجھتا ہے اور اس کی تکمیل کا خواہشمند ہوتا
ہے۔ اس معیار کے مطابق سب کو اُن کے حقوق ملنا اور سب کو پوری
آزادی ہو جانا غیر ممکن ہے۔ اب ایک صورت یہ ہے کہ ایک کو مکمل آزادی
دیدی جائے اور دوسروں سب کو مقید کردیا جائے مگر یہ وہی کرسکتا ہے
جس کو اس ایک کے ساتھ کوئی جانبداری اور رشتہ داری ہو، بہرحال

عقل و انصاف کی بارگاہ میں یہ صورت قابل قبول نہیں، دوسری صورت یہ ہے کہ سب کو حصہ رسدی آزادی کی تقسیم ہو اور سب کے حقوق کی کسی بالادست طاقت کی طرف سے تعیین ہو جس کی وجہ سے تصادم کا امکان جاتا ہے مگر یہ تقسیم اور تعیین کرے کون۔ کیونکہ دنیا میں مختلف حیثیتوں سے تفریق قائم ہے اور کوئی شخص بھی ہو اُسے کسی ایک فرد یا جماعت سے زیادہ تعلق اور دوسروں سے کم تعلق ہونا یقینی ہے اور اس لحاظ سے جانبداری کا امکان ہے اور پھر تمام جماعتوں کے ضروریات و حقوق سے یکساں طور پر کسی کا باخبر ہونا بھی ممکن نہیں ہے اس لئے ضرورت ہے کہ حدود اور حقوق کی تعیین کرنیوالی ایک ایسی ہستی ہو جسکو تمام افراد بشر کے ساتھ یکساں تعلق ہو۔ اسی کیطرف سے عائد کردہ قانون سب کیلئے یکساں طور پر قابل عمل ہو سکتا ہے اور وہی قانون کہ جو سب کیلئے حدود آزادی کی تعیین کردے اسکا نام مذہب ہے اور اسکا نافذ کرنیوالا خدا ہے جسکو تمام کائنات کے ساتھ یکساں تعلق حاصل ہے۔

مذہب ضمیر اور دل پر حکمران ہوتا ہے، اور چونکہ دل کی سلطنت تمام اعضائے جسم انسانی پر ہے اس لئے تمام انسان کے افعال و اعمال قیود و حدود کے تحت میں انجام پاتے ہیں ۔

مذہب سے قطع نظر کرکے ہم کسی طاقتور سے اس مطالبہ کا حق نہیں رکھتے کہ وہ اپنی طاقت سے فائدہ نہ اٹھائے۔ کیونکہ دنیا کی ہر چیز فائدہ اٹھانے کیلئے ہے اور فائدہ جو کچھ ہے وہ اسی دنیا کا وقتی فائدہ ایک شخص جس کے بازوؤں میں قوت ہے، تلوار میں باڑھ ہے، مدمقابل کمزور ہے اور اس کی پامالی سے ایک بہت بڑے نفع کی امید ہے کس سہارے

پر اپنا ہاتھ روکے اور کس امید پر اپنے مقصد کے حاصل کرنے سے باز آئے۔

مگر مذہب وہ ہے جو انسان کے جذبۂ اقتدار اور غرور فوقیت کو شکست دیتا ہے، وہ انسان کی نگاہ کو بلند کرتا ہے۔ اور اس وقتی و عارضی مفاد کے آگے ایک کامیابی و ناکامی کا تصور پیدا کرتا ہے اور اُسی کے سہارے پر ایک طاقتور انسان طاقت کے ناجائز استعمال سے باز رہتا ہے اور کمزور اور ناتوان اشخاص کو سانس لینے کا موقع مل سکتا ہے، مذہب دنیا میں امن و امان اور نظام اجتماعی کے برقرار رہنے کا واحد ذمہ دار ہے۔

یہ اور بات ہے کہ دنیا میں مذہب ہی کے نام پر فتنہ و فساد برپا ہوں اور جنگ و جدال قائم ہو مگر مذہب اس کا ذمہ دار نہیں ہو سکتا۔ نہ اس کی وجہ سے مذہب فنا کئے جانے کے قابل ہے۔ یہ اپنی نگاہ کا قصور ہوگا کہ انسان نقل اور اصل میں تمیز نہ کر سکے انسان اگر ایمیٹیشن سے دھوکا کھائے تو باقوت کو بُرا نہ کہے بلکہ اپنی نگاہ کی کمزوری کا اقرار کرے۔ اگر ملمع کو اصلی سونا خیال کرے۔ یوں ہی اگر مذہب کے نام سے کسی دام فریب میں مبتلا ہو جائے، تو مذہب کا شکوہ نہ کرے اپنی نگاہِ غلط انداز کی کوتاہی کا احساس کرے۔

انسان کو چاہیئے کہ سوچے سمجھے اور غور کرے، دیکھے کون مذہب حق ہے اور کون باطل۔ کون آواز جو مذہب کے نام سے بلند کی گئی

حقیقت پر مبنی ہے اور کون جعلسازی مکاری اور ابلہ فریبی پر۔
اسی لئے مذہب کی تحقیقات کا دروازہ ہر شخص کے لئے کھلا رکھا گیا ہے۔ اور کسی کے لئے صرف باپ دادا کے راستے کی پابندی اور ان کے اختیار کئے ہوئے مسلک کی لاج کو ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کے لئے کافی نہیں سمجھا گیا ہے۔

اِسلامی عقائد کا اثر

افعال و اعمال پر

انسان کے افعال و اعمال اس کی ذہنیت کے ماتحت ہوتے ہیں اور ذہنیت کی تشکیل عقائد و خیالات سے۔ اسلام نے جن عقائد کی تلقین کی ہے، وہ سب ایسے ہیں کہ جو انسان کو بلند نگاہ بنانے والے ہیں اور اس کے افعال و اعمال میں بلندی و شائستگی پیدا کرنے کے باعث ہیں۔

توحید

سب سے پہلا تحفہ جو مذہب کی طرف سے عالم انسانیت کیلئے پیش ہوا ہے وہ خدائے واحد کا اقرار ہے۔ اس کی وجہ سے تمام افراد انسانی ایک رنگ میں رنگ جاتے ہیں اور ایک کیفیت میں سمو جاتے ہیں۔
انسانی جماعت میں مختلف حیثیتوں سے تفریق ہے اور اس لئے ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو ذلّت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ان میں آپس میں محبت نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ کسی چیز میں وہ اپنے کو دوسرے کے ساتھ

متحد نہیں خیال کرتے لیکن اگر یہ احساس پیدا ہو جائے کہ ہم سب ایک خدا کے بندے ہیں تو سب ایک دوسرے کے ساتھ یگانگی اور اتحاد کا احساس کرنے لگیں
دنیا میں طاقتور کمزور پر اس لئے ہاتھ اٹھاتا ہے کہ اپنے سے بالاتر کوئی قوت نہیں سمجھتا اور کمزور اس لئے شکستہ دل ہو جاتا ہے، کہ اپنی پشت پر کسی کو مدد گار نہیں دیکھتا۔
خدائے واحد کا عقیدہ طاقتور کے سرِ غرور کو جھکاتا ہے اور اس کے دل میں ایک غیبی طاقت کا اندیشہ پیدا کرتا ہے اور کمزور کی نگاہ کو اٹھاتا ہے اور اس کے دل میں امید کی لہر پیدا کرتا ہے۔
اس کا نتیجہ ہے کہ مختلف طاقتوں میں توازن قائم ہوتا ہے۔ اور زندگی کی کشمکش میں کمزور بھی طاقتور کے ساتھ جد و جہد کے قدم اٹھاتا ہے
مضطرب دل کے لئے سکون، ٹوٹے ہوئے دل کا آسرا، مایوسیوں کے عالم میں دلاسا اگر ملتا ہے تو خدائے واحد پر ایمان سے۔ مادہ پرست انسان کی زندگی ایک ایسی کشتی ہے جس کا کوئی ساحل نہیں مگر خدا پرست انسان کی کشتی کتنی ہی طوفانی ہو اور تھپیڑوں میں کروٹیں لے رہی ہو مگر پھر بھی وہ پُر امید ہے۔ اس لئے کہ اس کشتی کا ایک ساحل ہے اور اس کا ایک ناخدا ہے اور وہ پردۂ غیب کا پوشیدہ خدا ہے۔

علمِ خُدا

فلاسفہ اور حکماء نے خدا کے علم کو کلیات کے ساتھ محدود قرار

کی ذات اُن کے علم سے خدا کی ذات
دیا ہے۔ اس لئے کہ جزئیات متغیّر ہیں، اُن کے علم سے خدا کی ذات
میں تغیّر لازم آئے گا۔ یہ استدلال غلط ہے۔ معلومات کے تغیّر سے علم میں
تغیّر ضروری نہیں ہے اور اس لئے ذاتِ الٰہی میں بھی تغیّر لازم نہیں آتا۔
بہر حال مذہب حق کی تعلیم اس سے جداگانہ ہے۔
مذہب کہتا ہے کہ خدا کو ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کا علم ہے۔ امیرالمومنینؑ
نے نہج البلاغہ میں اس کو جس طرح بیان کیا ہے وہ ایک ایسا انداز ہے
جو دماغوں میں اس حقیقت کو بالکل جاگزیں کر دیتا ہے۔ حقیقت میں تو یہ
ایک جملہ ہے کہ "خدا ہر بات سے واقف ہے" مگر اسکے دل و دماغ پر وہ
اثر نہیں پڑتا جو تجربہ و تحلیل کے ساتھ معمولی اور انتہائی چھوٹی چیزوں کی
تفصیل کے بیان کے ساتھ پڑتا ہے۔
"ابوالائمہ کے تعلیمات" رسالہ میں جو امامیہ مشن سے شائع ہوا ہے۔
امیرالمومنینؑ کے وہ اقوال نقل کئے گئے ہیں۔ خداوندی علم و اطلاع
کی اس وسعت کے احساس سے انسان کی عملی زندگی پر بہت بڑا اثر پڑتا ہے
غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ گناہ کے لئے انسان کو فطرتاً ایک خواہش "اخفا"
ہوتی ہے۔ انسان معمولی معمولی آدمیوں سے چھپتا پھرتا ہے کہ گناہ کرتے
اس کو دیکھ نہ لیں وہ تذکرہ سُن لیتا ہے اپنے جرم کا' تو دل دھک
سے ہو جاتا ہے اور چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں' یہ اُن
لوگوں کا ذکر ہے جنہیں احساس گناہ باقی ہو۔ اور گناہ کو فخریہ انداز
پر نہ کرتے ہوں' خصوصاً ایک انسان اس شخص سے تو بہت زیادہ اخفا

کی کوشش کرتا ہے کہ جس کا جرم ہو۔ کسی کو ہم بُرا کہہ رہے ہوں اور
وہ آتا ہوا نظر آئے فوراً زبان کو روک لیں گے، خاموش ہو جائیں گے
اس غرض سے کہ اس کو اطلاع نہ ہو، شرط یہ ہے کہ اس شخص کا کچھ بھی
لحاظ، عظمت اور عزت نگاہ میں ہو پھر جب معمولی اشخاص کا یہ حال ہو
تو اگر کسی کو یقین ہو اس کا کہ خدا اس کے اعمال کا حاضر و ناظر ہے ہر وقت
وہ اس کے افعال کا نگراں ہے اور اس کی ذرا ذرا سی بات کا اس کو
علم ہے تو کیا ممکن بھی ہے کہ انسان کسی گناہ کا ارتکاب کرے۔
اسی بنا پر خداوند عالم نے اپنے علم کا تذکرہ قرآن میں اکثر افعال
خلق ہی کے لحاظ سے کیا ہے۔ مثلاً اِنَّ اللّٰہَ بَصِیْرٌ بِمَا یَعْمَلُوْنَ۔ اِنَّ اللّٰہَ
بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْر۔ اِنَّ اللّٰہَ خَبِیْرٌ بِمَا یَصْنَعُوْنَ۔ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ بِمَا
تَفْعَلُوْنَ وغیرہ وغیرہ۔ اور انسان کی خواہش اخفاء کو دکھلاتے ہوئے
ارشاد ہوتا ہے۔ یَسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا یَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰہِ وَ
ھُوَ مَعَھُمْ اِذْ یُبَیِّتُوْنَ مَا لَا یَرْضٰی مِنَ الْقَوْلِ وَکَانَ اللّٰہُ بِمَا یَعْمَلُوْنَ
مُحِیْطًا "یہ لوگ آدمیوں سے چھپتے پھرتے ہیں اور اللہ سے نہیں چھپتے
حالانکہ وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ جبکہ وہ راتوں کو ایسے مشورے کرتے
ہیں جو خدا کو ناپسند ہیں اور خدا ان کے اعمال سے پورے طور پر باخبر ہے"
دنیا کے ہر شعبہ میں مکر و فریب، خیانت، دغا بازی، ایذا رسانی
چوری، فسق و فجور۔ بدکاری سب کا نتیجہ ہے اس کا کہ انسان خدا کو
اپنے دل سے واقعی طور پر حاضر و ناظر نہیں سمجھتا۔ دنیا والوں کے یہ

ذہن نشین ہو جائے کہ خدا حاضر و ناظر ہے تو دنیا امن و امان کا گہوارہ بن جائے اور ہر قسم کی بد اعمالیوں کا سدِّ باب ہو جائے ۔

حکمت و عدالت

"خداوندِ عالم" کے افعال کیسے ہو سکتے ہیں۔ اس جگہ ایک طبقہ کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا خیر و شر دونوں کا خالق ہے اور یہ کہ ظلم، ناانصافی غلط بیانی وغیرہ۔ تمام قبائح یعنی بری باتیں اس کے لئے جائز ہیں وہ جو چاہے کرے، اس کے لئے کوئی پابندی نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ جب خداوندِ عالم کی ذات کے متعلق ہمارا نقطۂ نظر اس درجہ تک محدود رہے گا تو اس کے بعد کی منزلیں اس سے پست ہی ہوتی جائنگی مثل مشہور ہے "وزیرے چنیں شہریارے چناں"

جب خدا اس طرح کا ہے تو اس کا رسول اسی اعتبار سے ہوگا اور جب رسول کا درجہ یہ ہوگا تو اس کے جانشین ایسے ہی ہونگے اور جب پیشواؤں کا یہ عالم ہوگا تو متبعین کا پوچھنا ہی کیا؟

جب الوہیت کی منزل "جائز الخطا" ہونے کی سطح پر قائم ہوتی ہے تو نیچے کے درجوں میں "عصمت" کا خیال ہی غیر ممکن ہے۔

اس عقیدہ سے بری باتوں کی برائی بالکل سبک ہو جاتی ہے اور ظلم وغیرہ کی اہمیت انسان کو محسوس نہیں ہوتی۔ ممکن ہے کہ اس عقیدہ کے رکھنے والوں میں بھی ایسے افراد ہوں اور واقعی ہوتے ہیں کہ جو اپنے

اخلاق کے لحاظ سے شائستہ انسان کہے جاسکیں، مگر یہ ان کے حسن فطرت کا نتیجہ ہے، ان کے مذہبی عقیدہ کا ہرگز یہ تقاضا نہیں ہے۔ اس کے برخلاف مذہبِ حق کی تعلیم یہ ہے کہ خدا کی ذات تمام برائیوں سے منزہ و مبرا ہے۔ وہ عادل ہے اور حکیم ہے۔ اس کا ہر فعل خیر ہی ہے اور شر کا اس سے یہاں گزر نہیں ہے۔ قرآن مجید نے خداوندِ عالم کے اوصاف کے تذکرہ میں بہت اس عملی پہلو پر توجہ کی ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ ۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُفْسِدِیْنَ وغیرہ وغیرہ۔

پھر جب وہ دوسروں سے ظلم اور فساد وغیرہ کو پسند نہیں کرتا تو اپنی جانب سے کیونکر پسند کریگا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کی قدرت محدود ہے یا وہ عاجز ہے۔ بلکہ وہ اپنے کمال ذاتی اور حکیمانہ رفعت کے لحاظ سے غیر ممکن ہے کہ ان باتوں کا مرتکب ہو اس سے انسان کے ذہن میں ان باتوں کی برائی اور قبیح افعال سے نفرت کا احساس راسخ ہوتا ہے اور اس میں طبعی طور پر ان چیزوں سے علٰحدگی کا خیال پیدا ہوتا ہے۔

جبر و اختیار

ایک فریق کا عقیدہ ہے کہ انسان جو کچھ کام کرتا ہے وہ خدا کی جانب سے ہیں، انسان نماز پڑھتا ہے تو وہ نہیں پڑھتا بلکہ خدا پڑھواتا ہے۔ اور یہ شراب پیتا ہے تو خود سے نہیں پیتا بلکہ خدا پلواتا ہے۔ انسان مثل ایک بیجان آلہ کے خدا کے ہاتھ میں متحرک ہے اور یہ

کوئی بات اپنی طرف سے نہیں کرتا۔

یہ عقیدہ اگر دنیا کے دماغ پر پورا اثر کرے تو دنیا میں کوئی مجرم اپنے جرم کے بعد خجالت محسوس ہی نہ کرے اور نہ کوئی گنہگار اعترافِ گناہ کرے۔ اصلاح کے دروازے بند ہو جائیں اور تعلیم و تربیت بیکار قرار پائے۔ اس لئے کہ دنیا میں جو کچھ افعال ہوتے ہیں وہ انسان کی جانب سے نہیں بلکہ خدا کی طرف سے ہوتے ہیں۔ بلکہ اس لحاظ سے ایک گنہگار اور مجرم انسان عزت کا مستحق ہے کہ وہ منشاء الٰہی کی تکمیل کا ذریعہ اور مشیت خداوندی کا عملی مظہر ہے۔

کیا اس طرح نظامِ زندگی کی عملی اصلاح ہوسکتی ہے اور افراد انسانی کے اخلاق کی تکمیل ممکن ہے؟

ائمہ معصومین کی تعلیم اور مذہب کا صحیح عقیدہ یہ ہے کہ انسان اپنے افعال کا ذمہ دار ہے۔ اچھے کام بھی وہی کرتا ہے اور بُرے کام بھی وہ اپنے اختیار سے کرتا ہے۔

بے شک اچھے کاموں میں خدا کی طرف سے امداد ہوتی ہے جس کا نام ہے توفیق۔ مگر اس کی وجہ سے وہ فعل انسان کے حد اختیار سے خارج نہیں ہوتا۔ اور بُرے کاموں کیلئے اکثر خارجی تحریکات اور شیطان کے وسوسے متحرک ہوتے ہیں مگر پھر بھی انسان بے بس نہیں ہوتا اور جزا و سزا سب انسان کے ذاتی افعال کا نتیجہ ہے اور اس لحاظ سے ہر انسان کو اپنے اصلاح عمل کا موقع حاصل ہے اور اس کا فرض ہے کہ

وہ جرائم سے اجتناب کرے اور اچھے اعمال کی پابندی اختیار کرے ایسا نہ کرنے کی صورت میں مجرم وہی ہوگا اور اس کی ذمہ داری کسی دوسرے پر عائد نہ ہوگی۔

بداء

یہود کا عقیدہ تھا کہ خدا نے جو کچھ مقرر کرنا تھا ازل میں مقرر کر چکا۔ اب وہ کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا، قرآن مجید میں اس عقیدہ کا ان الفاظ میں تذکرہ کیا گیا ہے اور اسکی رد کی گئی ہے۔ کہ "قَالُوا یَدُ اللّٰہِ مَغْلُولَۃٌ غُلَّتْ اَیْدِیْھِمْ وَلُعِنُوا بِمَا قَالُوا بَلْ یَدَاہُ مَبْسُوطَتَانِ یُنْفِقُ کَیْفَ یَشَآءُ" یہ کہتے ہیں کہ خدا کے ہاتھ بندھ گئے ہیں۔ خود ان کے ہاتھ بندھے ہوئے ہوں گے اور یہ مستحق لعنت ہیں اپنے اس قول کی وجہ سے بلکہ اس کے ہاتھ کھلے ہوئے ہیں وہ جس طرح چاہتا ہے عطا فرماتا ہے"

بدقسمتی سے مسلمانوں کے ایک بڑے حلقہ میں بھی یہ خیال پیدا ہوگیا کہ خدا کے مقررہ فیصلوں میں تبدیلی ناممکن ہے وہ کہتے ہیں کہ فیصلہ کا تبدیل کرنا پشیمانی کا نتیجہ ہوتا ہے اور پشیمان وہی ہوتا ہے کہ جو نتائج سے بے خبر ہو۔ خدا کے فیصلوں میں تبدیلی کا قائل ہونا اس کے وسعتِ علم کا انکار کرنا اور اس کو انجام سے ناواقف قرار دینا ہے۔ اس لئے درست نہیں۔ شیعہ فرقہ کے عقیدہ میں خداوند عالم کے احکام مصالح و اسباب کے لحاظ سے ہوتے ہیں۔ اس لئے صورتِ حال اور اسباب

کی تبدیلی کے ساتھ اُن احکام میں بھی تبدیلی ہونا چاہیئے، اسی کا نام بداء ہے
یہ کہنا کہ فیصلہ کی تبدیلی ہمیشہ پشیمانی اور عاقبت نا اندیشی ہی کا نتیجہ
ہے۔ درست نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ہو سکتا ہے کہ قرارداد کسی وقتی
مصلحت پر مبنی ہو اگرچہ فیصلہ کرنے والے کو پہلے سے یہ علم ہو
کہ آئندہ اس طرح سے تبدیلی واقع ہوگی۔ اس کی مثال یہ ہے
کہ آپ کے یہاں ملازم کی تنخواہ کی ایک شرح مقرر ہے اور
وہ سات روپیہ ماہوار ایک نیا ملازم آپ کے یہاں آتا ہے۔ ممکن ہے
آپ جانتے ہوں کہ یہ اتنا وفادار اتنا ہنرمند اور با سلیقہ ہے کہ اس
کے خدمات کے صلے میں مجھ کو بعد میں ایک روپیہ ماہوار کا اضافہ
اس کی تنخواہ میں کرنا پڑے۔ مگر اس وقت ایسی کوئی وجہ
نہیں پائی جاتی جس کی بنا پر اپنے عام اصول کو توڑ دیں لہٰذا آپ
خود اس ملازم کو بھی یہی تبلائیں گے کہ تمہاری تنخواہ سات روپیہ
ماہوار ہے اور دوسرے لوگوں سے بھی یہی کہیں گے اور رجسٹر پر بھی
یہی درج کریں گے۔ بے شک جب وہ کوئی ایسی خدمت کرے گا
یا کوئی خاص وفاداری کا ثبوت پیش کرے گا تو آپ اسکی تنخواہ
میں اضافہ کردیں گے اس وقت خود اس سے بھی کہیں گے کہ تمہاری
تنخواہ بڑھا دی گئی اور اپنے رجسٹر کی بھی تبدیلی کرینگے مگر کیا اس کی
وجہ سے آپ کی عاقبت اندیشی اور انجام بینی پر اثر پڑتا ہے۔ ہرگز نہیں۔
یوں ہی سمجھ لیجئے۔ خداوند عالم کی قراردادیں مصالح و حکم پر

مبنی ہوتی ہیں وہ قیامت تک کی تبدیل ہونے والی تمام صورتوں کو
ہمیشہ سے جانتا ہے۔ مگر کسی خاص سبب کے ظہور پذیر ہونے کے
پہلے اس کے مطابق قرار دینا حکمت و مصلحت کے خلاف ہے۔ لہٰذا جیسا
وقت ہوگا ویسی بات ہوگی، قرارداد فعل ہے اور علم صفت، فعل تبدیل
ہوتا ہے۔ مگر علم ازلی ہے اس میں تبدیلی ہرگز نہیں ہے۔
اب دیکھیئے کہ اس عقیدہ کا انسان کے عمل پر کیا اثر پڑتا ہے ظاہر
ہے کہ بیشتر افراد بشر خود غرض ہوتے ہیں۔ یعنی اپنا کوئی فائدہ چاہتے
ہیں اور ایسے بلند نظر اشخاص کم ہوتے ہیں جو صرف "مرضی مولیٰ از ہمہ
اولیٰ" کے اصول پر اعمال بجا لائیں۔ اگر انسان یہ سمجھے کہ جو کچھ وہ
کرتا ہے۔ اس کا کوئی نتیجہ نہیں ہے۔ بہرحال خدا کے جو فیصلے
ازل میں ہو چکے ہیں وہ ہو کر رہیں گے۔ تو انسان جدوجہد، کوشش و
عمل کو بیکار سمجھے گا، اور محنت و مشقت کا کوئی فائدہ محسوس نہ کریگا
کیونکہ جو کچھ ہونے والا ہے بہرحال ہوگا۔ اس کے کئے سے کچھ نہ ہوگا
لیکن اگر انسان یہ سمجھے گا کہ ہمارے افعال و اعمال سے تقدیر بھی
بدل جاتی ہے۔ اور خدا کے فیصلے بھی ہمارے حالات کے لحاظ
سے تبدیل ہوتے ہیں تو اسے احساس پیدا ہوگا کہ ہم اپنے عمل کی کیفیت
کو بہتر بنائیں تاکہ ہمیں بہتر نتیجہ حاصل ہو سکے۔
خداوند عالم اپنے بندوں کے لحاظ سے صرف ایک حاکم اور
فرمانروا کی حیثیت نہیں رکھتا۔ جس کو زبردستی اپنے حکم کے منوانے سے

غرض ہو بلکہ وہ اس کے ساتھ ایک خیر خواہ ناصح اور مبشر کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ اس لیئے وہ اپنے احکام میں ایک طرف آمرانہ حیثیت سے آخرت کے انعام اور مخالفت پر سزائے اخروی کا پیغام دیتا ہے۔ اور دوسری طرف وہ ان افعال و اعمال کی افادی حیثیت کو ظاہر کرتے ہوئے اُن کے دنیوی فوائد یا خواص سے بھی مطلع کرتا ہے۔

صدقہ ردّ بلا کا باعث ہے۔ غریبوں کی خبر گیری کرنا عمر میں اضافہ کا سبب ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ انسان کے لیئے ایک بہترین عمل کا محرک ہے۔

فرض کیجئے وہ حضرت عیسیٰ کا مشہور واقعہ کہ آپ نے ایک عروس کے متعلق حکم لگایا تھا کہ اس کا کل انتقال ہو جائے گا اور دوسرے دن ایسا نہیں ہوا اور تحقیق پر یہ معلوم ہؤا کہ اس نے ایک بھوکے کو سیر کر دیا تھا اس لیئے بلا رد ہو گئی اور عمر میں اس کی وسعت ہو گئی یہ واقعہ آپ کے سامنے ہؤا ہوتا تو کیا اسی طرح آپ سائلوں کو رد کر دیا کرتے اور غریبوں کی طرف سے منہ پھیر لیا کرتے جیسا اب کرتے ہیں۔

قرآن مجید اور اس کے آیات کو تدبّر کی نگاہ سے دیکھیئے اور تعلیمات مذہبی پر غور کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ مذہب کے مسلّمہ عقائد و تعلیمات میں بہت سی باتیں وہ ہیں جن کی حقیقی بنیاد یہی چیز ہے کہ خدا کے فیصلے اسباب و مصالح کے لحاظ سے بدلتے ہیں

اور یہی وہ ہے جس کا نام ہے بداء۔ جس کو ہمارے لیئے سرمایۂ طعن و تشنیع قرار دیا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہوں ذیل کے امور:۔

۱۔ مغفرت خدا گناہوں کو بخشتا ہے، تمام مسلمانوں کا عقیدہ ہے دریافت طلب یہ ہے کہ جس وقت گناہ کیا اس وقت یہ شخص مستحق عذاب بنا یا نہیں۔ اگر نہیں تو بخشش کے کوئی معنی نہیں اور اگر بن گیا تو مغفرت کے بعد وہ حکم بدلا یا نہیں۔ اگر نہیں تو بخشش کوئی چیز نہیں اور اگر بدلا تو یہی وہ ہے کہ جس کا انکار کیا جا رہا تھا اس عنوان کے تحت میں تمام وہ کثیر التعداد آیات قرآنی پیش کئے جا سکتے ہیں جن میں مغفرت کا تذکرہ ہے۔

۲۔ توبہ بندوں کی توبہ جو سچے دل سے ہو قبول ہوتی ہے۔ یہ مسلمانوں کا متفقہ عقیدہ ہے۔ اس کے معنی یہی ہیں کہ انسان گناہ کرنے کے بعد عذابِ خدا کا مستوجب بن گیا تھا اور توبہ کی وجہ سے کہ جو انسان کا فعل ہے۔ اس قرار داد میں تبدیلی ہو گئی۔ اس وقت یہ اہل نار سے تھا اور اب یہ اہلِ جنت سے ہے۔

کیا یہ وہی چیز نہیں ہے جسے بداء کہکر موردِ اعتراض قرار دیا جاتا ہے۔

۳۔ شفاعت انبیاءؑ اور معصومینؑ بلکہ عام مومنین اور بالخصوص حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیئے شفاعت کا درجہ تمام مسلمانوں کے نزدیک ثابت ہے۔ یعنی آپ کی سفارش بہت سے گناہ گاروں کی مغفرت کا سبب ہوگی اب بتلایئے

کہ اس سفارش کے پہلے یہ اشخاص جہنّم میں جانے والے تھے یا نہیں اگر نہیں تو سفارش کی ضرورت نہیں اور اگر تھے تو شفاعت سے فیصلہ بدلا یا نہیں۔

۴۔ دُعاء قرآنِ مجید میں دعا کا حکم موجود ہے اور اس کی قبولیت کا وعدہ کیا گیا ہے۔ جمہورِ مسلمین کا عقیدہ بھی اسی کے مطابق ہے۔ مگر کیا اس خیال کے مطابق کہ جو کچھ فیصلہ ہونا تھا۔ ہو چکا۔ اور وہ قابل تبدیلی نہیں ہے۔ دعا کا کوئی نتیجہ قرار پاتا ہے اور قبولیت دعا کے کوئی معنی ہو سکتے ہیں۔

دُعا اور اُس کی قبولیت سے صاف ظاہر ہے کہ انسانی افعال کے لحاظ سے مقررہ باتوں میں تبدیلی ہو سکتی ہے اور اسی کا نام بدا ہے

اس کے علاوہ اگر غور کیا جائے تو کفر کے بعد ایمان لانے سے نجات کا حکم بالکل اسی بنیاد پر مبنی ہے

ایک شخص پہلے کافر تھا، اس کے متعلق حالتِ کفر میں خداوندی فیصلہ کیا ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ وہ مخلد فی النّار ہے یعنی ہمیشہ جہنّم میں رہے گا! آپ کسی نبی و رسول سے پوچھئے تو وہ اس کے متعلق یہی حکم لگائے گا اس لئے کہ اس کے کافر ہونے کا تقاضا یہی ہے۔ اس کے بعد وہ ایمان لے آتا ہے۔ اور کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ زبان پر جاری کر کے دل سے مسلمان ہو جاتا ہے۔ بتائیے اب اسکا کیا حکم ہے؟ یہ کہ جنت کا مستحق ہے اور اگر ابھی دنیا سے سدھار جائے، تو

بلا حساب داخل بہشت ہوگا۔ دیکھئے انسانی طرزِ عمل اور حالات کی تبدیلی سے فیصلہ میں کتنی بڑی تبدیلی ہو گئی۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو قرآن شروع سے لے کر آخر تک عقیدۂ بداء کی تلقین کرتا ہے۔ کیونکہ وہ کافروں کو ایمان لانیکی دعوت دیتا ہے۔ اور اس پر نجات کا وعدہ کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ ایسا نہ کرو گے تو تم جہنّم میں جاؤ گے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خداوندی فیصلوں کو انسانی اعمال کے ساتھ وابستہ بناتا ہے اور انسان کے حالات کی تبدیلی سے انہیں قابل تبدیلی قرار دیتا ہے اور افراد انسانی کے اعمال و افعال کی اصلاح اس عقیدہ سے وابستہ ہے۔

بھلا اگر ابو جہل کو معلوم ہو جائے کہ میں لاکھ مسلمان ہوں مگر جو میرے متعلق فیصلہ ہو چکا وہ برقرار رہے گا تو اُسے اسلام لانے کی ضرورت کیا ہے۔ اور اگر ایک گنہگار انسان یہ سمجھ لے کہ اب لاکھ میں اچھے اعمال بجا لاؤں مگر میری نسبت جو فیصلہ ہو گیا ہے وہ تبدیل نہیں ہو سکتا تو اُسے کیا ضرورت ہے کہ وہ اپنی خواہشِ نفس کے برخلاف اچھے اعمال کا پابند بنے۔ انسانی افعال کی اصلاح موقوف ہے اس عقیدہ پر کہ خدا کے فیصلوں میں انسان کے مختلف حالات کے لحاظ سے تبدیلی ممکن ہے۔

میں نے جو چند سرخیاں قائم کر دی ہیں ان کے تحت میں آیات قرآن

کی کثیر التعداد صفیں قائم ہو سکتی ہیں اور اس کے علاوہ بہت سی خصوصی آیات ہیں جو بداء کے مسئلہ کو قطعی طور پر ثابت کرتے ہیں چونکہ میں نے اس موضوع پر اب تک کبھی قلم نہیں اٹھایا تھا اس لئے یہاں میں نے ذرا تفصیل سے کام لیا اور اگر موقع ملا تو آئندہ ایک کتاب لکھنے کے لئے یادداشت قلم بند کر دی۔ آئندہ میں اگر نہ بھی لکھ سکوں تو اسی مختصر تبصرہ کو سامنے رکھ کر کسی دوسرے صاحب قلم کے لئے مبسوط کتاب کی تصنیف کر لینا آسان ہے۔

نبوّت

الٰہیات کے بعد نبوّت کا درجہ ہے، پیغمبر کی ضرورت کے باب میں اربابِ مذاہب میں کوئی اختلاف نہیں ہے، بے شک نبی کے اوصاف کے متعلق زاویۂ نگاہ مختلف ہو گیا ہے۔

بہت سے لوگ انبیاء کے لئے عصمت کو ضروری نہیں سمجھتے اور کسی نہ کسی حد تک گناہ کی اجازت دیتے ہیں خواہ یہ کہ وہ گناہِ کبیرہ سے معصوم ہوتے ہوں مگر صغیرہ گناہوں کا ارتکاب کر سکتے ہیں، خواہ یہ کہ بعد بعثت معصوم ہیں، مگر قبل بعثت گنہگار رہو نا ممکن ہے، خواہ یہ کہ جان بوجھ کر گناہ نہیں کرتے، مگر غلطی یا سہو و نسیان سے ارتکاب ممکن ہے۔ فرقہ شیعہ کا یہ عقیدہ ہے

کہ انبیاء تمام گناہوں سے ہر حال میں معصوم ہیں۔

عقلی استدلال کے لحاظ سے یہ مسئلہ بالکل صاف ہے۔ انبیاء آتے ہیں ہدایتِ خلق اللہ کے لئے۔ لہٰذا ان کے ہاتھوں کسی طرح گمراہی خلق اللہ کا اندیشہ نہ ہونا چاہئے اور اگر نبی کسی طرح بھی غلطی کا مرتکب ہو تو اس سے کسی نہ کسی حد تک خلق خدا کے گمراہ ہونے اور غلط فہمی میں مبتلا ہونے کا ضرور امکان ہے۔

اب دیکھئے کہ انسان کی عملی زندگی پر اس مسئلہ کا کیا اثر پڑتا ہے؛ یہ بالکل صاف ہے۔ اگر یہ خیال قائم کر لیا جائے کہ انبیاء بھی گناہوں کے مرتکب ہوتے تھے تو عام افراد کی نگاہ میں گناہ کے ارتکاب کی کوئی اہمیت نہیں باقی رہے گی۔ بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ یہ عقیدہ دنیا کو ارتکاب گناہ کی دعوت دیتا ہے کیونکہ ہر شخص سمجھے گا کہ جب انبیاء ایسے بلند افراد ایسے افعال کا ارتکاب کر سکتے ہیں تو ہمارے لئے ان کا ارتکاب کیا قابلِ الزام ہو سکتا ہے۔

اس کے خلاف یہی عقیدہ کہ انبیاء کا دامن گناہوں سے بالکل بری ہے خلقِ خدا کی اصلاح اور عملی تکمیل کا باعث اور اس کا ذمہ دار ہو سکتا ہے۔

امامت

رسول کے بعد ہدایتِ خلق اور فرائض دینیہ کے قیام کے

لئے ایک حاکم و فرمانروا کی ضرورت ہے۔ مسلمانوں میں سے ایک
طبقہ کا خیال ہے کہ اس کے انتخاب کا حق جمہورِ امت کو ہونا چاہیئے۔
وہ کہتے ہیں کہ امامت کو بطور نامزدگی رسول کی جانب سے
قرار دیا جانا اور یکے بعد دیگرے اماموں کا سلسلہ ہونا اصول جمہوریت
کے خلاف ہے مگر یہ خیال بالکل غلط ہے۔ جمہوریت کا اصول
تو اسی وقت شکستہ ہو گیا جب نبی کا انتخاب ہمارے قبضہ میں
نہیں ہوا اور جبکہ نبی کی نبوت کو ہم خدا کی طرف سے تسلیم کر چکے تو
کسی دوسرے کو اس میں چون وچرا کا یا اس کے خلاف اپنے حق
انتخاب کے پیش کرنے کا کیا حق ہے۔

چونکہ ہمارے افراد جذبات کے پابند ہوتے ہیں اور ہر چیز میں
خود غرضی اور مطلب براری ان کے پیش نظر رہتی ہے۔ اسلئے ان کا
انتخاب بالکل بے لوث اور غیر جانبدارانہ نہیں سمجھا جا سکتا۔ اور
اس میں غلطی کا بھی امکان ہے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ ہادی خلق کو
خدا اپنی جانب سے معین کرے اور جس طرح نبی اس کی طرف سے
مبعوث ہوتا ہے اسی طرح نبی کا جانشین بھی اسی کی طرف سے ہو۔
وہ کہ جو امام کے انتخاب کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں وہ اس کے لئے
معصوم ہونا ضروری نہیں سمجھتے کیونکہ عام افراد کی نگاہ عصمت تک جا
ہی نہیں سکتی۔

مگر جبکہ امام کا تقرر خدا کی طرف سے ہے تو اسے معصوم ہونا بھی

ضروری ہے ورنہ اس کے ہاتھوں خلق خدا کی گمراہی کا احتمال ہو گا۔ اور
اس کی ذمہ داری خدا پر عائد ہو گی۔

اس کا عملی نتیجہ وہی ہے کہ جو ہم نے عصمتِ انبیاء میں اس کے
پہلے ذکر کیا ہے۔ یعنی جب امام، پیشوا، اور رہنما گناہوں کا مرتکب ہے
تو عام افراد کی نگاہ میں گناہ سے کوئی خوف باقی نہیں رہے گا۔ بلکہ
ان کو ارتکابِ گناہ کی ایک سند ہاتھ آئے گی۔ افرادِ بشر کو گناہوں
سے علیحدہ رکھنے کے لئے یہی عقیدہ زیادہ فائدہ رساں ہے کہ
ائمہ گناہوں سے علیحدہ اور معصوم ہوتے ہیں۔

تولّا و تبرّا

یہ عقیدۂ امامت کا ایک ضمیمہ ہے۔ شیعوں کا عقیدہ ہے کہ جو
اہلِ فضیلت اور سچے رہنما ہیں ان کے ساتھ موالات اور جو غلط
دعویدار یا جھوٹے رہنما ہوں اُن سے علیحدگی، بیزاری اور بے تعلقی
لازم ہے۔ پہلے کا نام ہے تولّا دوسرے کا نام ہے تبرّا۔ ان دونوں
کا تعلق ہے عقیدہ و عمل سے۔ جن کا تعلق روح اور جسم دونوں
کے ساتھ ہے۔ رہ گیا زبان سے اس کا اظہار تو وہ اعتقاد اور
ضمیر کے اقرار کا لازمی نتیجہ ہے۔ جبکہ حالات سازگار ہوں
اور دل کی بات کو دل میں مخفی رکھنے کا کوئی مخصوص سبب نہ
ہو۔ اظہارِ حق بہر حال انسان کا فطری حق ہے۔ بے شک اجتماعی

د تمدنی مصالح کے لحاظ سے خود انسان کو اپنی نگرانی کرنا ضروری ہے
اچھے کو اچھا اور بُرے کو بُرے کہنا "فطرتِ آزاد" کا ایک طبعی
تقاضا ہے جس سے انکار کرنا فطرت سے جنگ کا مرادف ہے
مگر وہ لوگ کہ جو اپنی طرف کسی نشیب کا احساس کرتے ہیں۔ اس
کے شدت کے ساتھ مخالف ہیں وہ کہتے ہیں کہ اچھے کو اچھا تو کہو مگر
بُرے کو بُرا ہرگز نہ کہو۔

مولانا ابو الکلام آزاد نے جو ملّتِ اسلام کے ایک بالغ نظر عالم
اور بڑے سیاسی رہنما ہیں اپنے ایک مضمون میں اس موضوع پر بہت
واضح تبصرہ کیا ہے۔ جو امامیہ مشن کی جانب سے "خلافت و امامت
حصۂ پنجم" کے ساتھ بطور ضمیمہ شائع کیا گیا ہے آپکو اس سے تولّا و تبرا
کا عملی نتیجہ بھی معلوم ہو جائے گا۔ حقیقتاً برائیوں سے نفرت مکمل
نہیں ہوتی جب تک برے افراد کو انسان بُرا نہ سمجھے اور علیحدگی
کا ان سے احساس قائم نہ رکھے اور برے افراد سے بے تعلقی
کا مظاہرہ انسان کی ذہنیت میں برائیوں سے علیحدگی اور بے
تعلقی کا جذبہ اس طرح راسخ کر سکتا ہے کہ جس کے بعد انسان
خود اپنے اعمال سے ان چیزوں کا ہرگز مرتکب نہ ہو۔

معاد

جزا و سزا کے لئے اس زندگی کے بعد ایک دوسرا دور مقرر

ہے، جہاں نیک اور بد اعمال کا اچھا اور بُرا بدلا دیا جائے گا۔
یہ تمام مسلمانوں کا متفقہ عقیدہ ہے۔ مگر آریہ لوگ جزا و سزا
کے لئے ایک دوسری صورت تجویز کرتے ہیں جس کا نام ہے "تناسخ"
اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی روح ایک جنم میں جو نیک اعمال
یا بد اعمال کرتی ہے ان کا بدلا دوسرے جنم میں دے دیا جاتا ہے
خواہ دوسرے انسان کے قالب میں یا جانور، درخت یا پتھر کی شکل
میں، اُن کا خیال ہے کہ روح اور مادہ دونوں قدیم ہیں۔ اور
روح برابر مختلف جسموں میں چکّر لگاتی رہتی ہے اور یہ "آواگون"
کا چرخا برابر چلتا رہتا ہے اور کبھی ختم ہونے والا نہیں۔

یہ مذہب عقلی حیثیت سے بالکل غلط ہے۔

جزا و سزا کا اصلی راز حقیقتہً اس کا احساس راحت یا الم میں
مضمر ہے جو انسان کو حاصل ہوتی ہے اور جس کا تعلق شعور و
ادراک سے ہے اور وہ اس تناسخ کی صورت میں بالکل مفقود ہے کیونکہ جب کوئی روح نئے جنم میں آتی
ہے تو اسے کوئی احساس نہیں ہوتا کہ اسکے پہلے جنم میں کیا کیا تھا اور اس کا کیا بدلہ ہو رہا ہے۔

اس کے علاوہ اگر اس کو نیا جنم جانور یا درخت یا پتھر کا حاصل
ہوا تو چونکہ اس عالم میں عقل و شعور ہی مفقود ہوتا ہے۔ اس لئے
اب اس کے اعمال ایسے نہیں سمجھے جا سکتے جو جزا و سزا کا تقاضا
رکھتے ہوں لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ یہ روح پھر کسی دوسرے قالب
میں جائے اور اگر وہاں جائے تو اسے نہ کوئی راحت

ہونا چاہیئے نہ کوئی تکلیف ۔ حالانکہ ان کے خیال میں روح کا سلسلہ تناسخ کبھی ختم نہیں ہوتا اور سعادت و شقاوت یعنی راحت و تکلیف سے دنیا کا کوئی ذی روح بالکل خالی نہیں ہے

پھر یہ دیکھیئے کہ روحیں حادث نہیں، قدیم ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نئی روحوں کی پیداوار تو ہوگی نہیں۔ اب غور کیجیئے کہ ازل میں سب روحیں قالب انسانی میں تھیں یا کچھ حیوانات اور کچھ نباتات اور کچھ جمادات کی شکل میں۔ اس صورت میں اوّل تو کوئی باعث ہی اس کا نہیں معلوم ہوتا کہ کچھ روحوں کو حیوانات یا نباتات یا جمادات کی شکل میں رکھا جائے حالانکہ یہ بداعمالیوں کا نتیجہ ہوتا ہے اور بداعمالیاں حادث چیزیں ہیں جو بعد کو ہوسکتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ دیکھنا چاہیئے کہ یہ روحیں جو قالب انسانی میں ہیں یہ بھی مختلف طرح کے اعمال کریں گی جن میں سے بعض حیوانات کے قالب میں جائیں گی، بعض نباتات اور بعض جمادات کے اور پھر وہ کہ جو انسان کی شکل میں آئیں گی ان میں بھی یہ تفریق قائم رہے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ افراد انسانی کی مردم شماری میں برابر کمی ہوتی رہے اور یہ تعداد برابر گھٹتی رہی۔ حالانکہ مشاہدہ اس کے خلاف شاہد ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ حیوان اور نبات اور جماد کے دور سے گزر کے اور سزا حاصل کر کے پھر روحیں پاک ہوتی ہیں اور انسانوں کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں تو یہ افراد انسانی

جو اُس دور کو ختم کر کے آنے والی روحوں کے حامل ہیں۔ ان کو نہ رنج ہونا چاہیئے، نہ کوئی راحت، نہ کوئی مسرت انہیں حاصل ہونا چاہیئے۔ نہ کوئی تکلیف۔ یہ بھی بالکل مشاہدہ کے خلاف ہے۔ دنیا کی کوئی فرد ان حالات سے ہرگز خالی نہیں ہے۔

بہت سے وہ بچے ہیں جو پیدا ہوتے ہی مر جاتے ہیں۔ انہیں دنیا میں نہ چین نصیب ہوتا ہے نہ تکلیف۔ اس کا کچھ سبب معلوم نہیں ہوتا۔ جبکہ روح کے نئے جنم میں لانے کا مقصد صرف جزا و سزا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس کا دنیا میں آ کے مر جانا ہی اس کے جزا و سزا کے لئے کافی ہے۔ تو پھر اس کے آگے سلسلہ چلنے کا کوئی باعث نہیں جبکہ اس دور میں کچھ ایسے اعمال نہیں جن کے لئے سزا و جزا کا موقع ہو۔

اس سب سے قطع نظر کر کے اس سلسلۂ لامتناہی پر ایک اصولی اعتراض ہے اور وہ یہ کہ جزا کے مفہوم میں یہ مضمر ہے کہ اس کے پہلے عمل مقدم ہے۔ اس لئے ایک ایسا نقطہ ماننا لازمی ہے کہ جہاں پر عمل ہو اور وہ بطور جزا نہ ہو۔ اس طرح یہ سلسلہ متناہی ہو جاتا ہے اور اب پہلے انسان کے متعلق یہ سوال ہوگا کہ کیا وہ دنیا میں خوشی اور رنج دونوں سے خالی رہا ہوگا۔ حالانکہ یہ بالکل فطرت کے آئین کے خلاف ہے۔

آریوں کی طرف سے تناسخ کے ثبوت میں ان آیات قرآنی

کو پیش کیا جاتا ہے جن میں بعض امم سابقہ کے مسخ ہونے کا تذکرہ ہے۔ حالانکہ مسخ اس تناسخ سے بالکل مختلف چیز ہے۔ وہاں روح اُس جسد کو چھوڑتی نہیں بلکہ اسی جسم کی شکل میں تبدیلی ہو جاتی ہے اور تناسخ میں وہ پہلا شخص مر جاتا ہے۔ اس کی لاش بے جان ہوتی ہے۔ اور یہ روح یہاں سے نکل کر کسی اور شکم مادر سے عنقریب متولد ہونے والے بچہ کے اندر پہنچتی ہے۔ اور اس کے ساتھ متولد ہوتی ہے۔ بھلا اُس کو اس سے کیا تعلق پھر یہ کہ مسخ صرف بعض امم کے لئے بطور دنیوی عقوبت کے بیان کیا گیا ہے اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ عام نظام جزا و سزا کا یہی ہے اور اس کے علاوہ روز آخرت کوئی چیز ہی نہیں ہے۔

عقیدۂ تناسخ کے لحاظ سے انسانوں کے افعال اور ان کی زندگی کی نوعیت ان کی اختیاری نہیں ہے۔ کیونکہ سابقہ دور میں جیسے اعمال کئے ہوں گے اس طرح کی زندگی انہیں نصیب ہو گی۔ ایک ڈاکو ہے تو وہ اس ڈکیتی پر مجبور ہے۔ کیونکہ یہ نتیجہ ہے اس کے پہلے جنم کے اعمال کا اور وہ اس کے قدرت و اختیار کے حدود سے اب باہر ہیں۔ انسان کا ہر حال ماضی کے ساتھ وابستہ ہے اور ماضی اختیار سے باہر۔ اس لئے انسان کا کوئی دور اس کا اختیاری نہیں قرار پاتا اور اس طرح جزا و سزا کا سوال ہی ختم ہو جاتا ہے۔

بہر حال اب دیکھیے کہ اخلاق و اعمال کی اصلاح کیلئے جزا و

سزا کا کون سا عقیدہ زیادہ کارگر اور مفید ہے۔

معلوم ہونا چاہیئے کہ انسان حقیقتاً جو ڈرتا ہے وہ اپنی تکلیف اور نفس کی اذیت سے، کیسی ہی حالت ہو، مگر وہ یہ سمجھ لے کہ اس میں کوئی ایذا نہیں ہے تو وہ ہرگز اس سے کوئی خوف نہ کرے گا انسان کا آئندہ جنم میں کسی شکل میں منتقل ہو جانا افراد انسانی کو دہشت زدہ اور متاثر نہیں کرے گا۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ جس جنم میں وہ ظاہر ہوں گے ان کی فطرت و طبیعت اسی جنم کے مطابق ہو گی اور انہیں ہرگز اس میں کسی الم نفسانی اور تکلیف کا احساس نہ ہو گا۔

دیوانہ ہو جانا ایک انسان کیلیئے کتنا ہی قابلِ افسوس ہو مگر یہ افسوس دوسرے کرتے ہیں، وہ ہرگز اس پر متاسف نہیں ہے بلکہ ممکن ہے کہ اس میں ایک کیف اور لذّت محسوس کرتا ہو۔

"دیوانہ باش تا غم تو دیگراں خورند"

اور پھر اگر سزا کی نوعیت اس انسان کی افتادِ طبع کے مطابق بھی ہو۔ مثلاً غلّہ کے چور کو چوہے کی شکل یا پانی کے چور کو مینڈک کی شکل، اور کسی بڑے مقدس انسان کے قاتل کو گائے کی شکل حالانکہ اس ذریعہ سے وہ خود ایک بڑے طبقہ کے نزدیک مقدس اور قابلِ تعظیم ہو گیا۔

ہرگز اس طرح کی سزا کا خیال وہ نہیں ہے کہ جو انسان کے

دل و دماغ پر اثر کرے اور اس کو اپنے اعمال کی نگہداشت
پر مجبور کرے برخلاف جزا و سزا کی ان تصویروں کے جو
اسلام نے پیش کی ہیں جن میں زیادہ نمایاں احساس راحت
اور وجدان تکلیف و الم کا ہے۔

پڑھئے قرآن کی یہ آیتیں :-

لَهُمْ فِيهَا زَفِيرٌ وَشَهِيقٌ —

يَقُولُ الْكَافِرُونَ هَذَا يَوْمٌ عَسِرٌ — يَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلَىٰ يَدَيْهِ

اور کفار کی تمنائیں اور حسرتیں۔ يَا حَسْرَتَىٰ عَلَىٰ مَا فَرَّطْتُ فِي جَنْبِ اللَّهِ
رَبِّ ارْجِعُونِ لَعَلِّي أَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ وغیرہ اس سے براہ راست
شعور و احساس کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ وہ ہے کہ جو دلوں کو اس عذاب
کی اہمیت سے متاثر کرتا اور اصلاح اعمال کی فکر دامنگیر کرتا ہے۔

بے شک اسلامی عقیدہ میں بھی اس دنیا کی جزا و سزا کا پتہ ملتا ہے
مگر وہ ہر شخص کو خود اس جنم میں کہ جس میں اس نے اعمال کئے ہیں
ممکن ہے کہ اُس کو بعض نعمتیں عطا ہوں۔ اس کی کسی نیک عمل
کی جزا میں یا کوئی مصیبت ڈالی جائے اس کے کسی برُے عمل
کی سزا میں۔ مگر اس سے روز آخرت کی ضرورت اور اسکی اہمیت
پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور خود یہ خیال کہ ہمیں ہمارے اعمال کا پھل اس
دنیا میں بھی مل سکتا ہے دنیا کو اصلاح عمل کی دعوت دینے کا ایک ذریعہ
ہے جس طرح یہ آیت کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ

جس کا مفاد یہ ہے کہ خدا کے انعام و عطا کی تبدیلی ان کے نفسانی
حالات کی تبدیلی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ انسان کیلئے اصلاح نفس اور اس کے
اعمال کا جائزہ لینے کی ایک بہترین تحریک ہے۔

گذشتہ بیانات کا نتیجہ

مذکورہ بالا بیانات سے صاف معلوم ہوا کہ وہی عقائد حقہ جن کی
اسلام نے تعلیم دی ہے انسانی افعال و اعمال کی اصلاح کا بہترین
ذریعہ ہو سکتے ہیں۔

اب اگر ہم دیکھیں کہ ہمارے مذہبی افراد اپنے افعال و اخلاق
کے لحاظ سے دوسری قوموں سے کوئی امتیاز نہیں رکھتے۔ بلکہ اکثر
حیثیتوں سے پستی میں ہیں تو ہمیں سمجھنا چاہئے کہ یہ عقائد حقیقتہً
ہمارے دلوں میں راسخ ہی نہیں ہوئے ہیں اور ان کا پورا اثر ہمارے
دماغوں پر قائم نہیں ہوا ہے۔

ہم کو کوشش کرنا چاہئے کہ جن عقائد کی ہم زبان سے تبلیغ
کرتے ہیں ہمارے افعال و اعمال بھی ان ہی کی ترجمانی کریں جب
ہی ہم صحیح طریقہ سے ان عقائد کے معتقد سمجھے جا سکتے ہیں۔

بہر حال ہم اگر اپنے بچوں کو صحیح طور پر مسلمان مومن بنانے
کا خیال رکھتے ہیں تو بچپنے ہی سے ہمیں ان کو مذکورہ عقائد کی تعلیم
دینا چاہئے نہ صرف اس طرح کہ انہیں دینیات کی کتابوں

کے الفاظ رٹوا دیئے جائیں بلکہ اس طرح کہ وہ عقائد ان کے ذہن نشین ہو جائیں اور وہ انہیں سمجھ لیں اور یقین کر لیں۔ یہاں تک کہ ان کی کالج اور اسکول کی زندگی میں ان کے ان عقائد پر کوئی اعتراض کیا جائے تو وہ جواب نہ دے سکیں نہ سہی مگر انہیں اضطراب ضرور پیدا ہو کہ ہمارے مذہب پر یہ اعتراض ہوا ہے تو ہمیں اس کا جواب دریافت کر کے پیش کرنا چاہیئے۔ اگر ہماری نوخیز نسل میں یہ جذبۂ تحقیق اور کاوش طلب پیدا ہو جائے تو یہی ان کے مذہب کی حفاظت کا بہت بڑا قلعہ ہوگا۔ کیونکہ ہمارا مذہب طاقتور ہے وہ اعتراضات و توہمات سے متزلزل نہیں ہو سکتا۔ مگر شرط یہ ہے کہ اس اعتراض کے دفعیہ کا خیال اور اسکے متعلق تحقیق اور جستجو کا جذبہ پیدا ہو۔

تمام شد۔ حصّۂ اوّل

امامیہ مشن پاکستان رجسٹرڈ لاہور کے مطبوعات معارف قرآنیہ اور حقایق اسلامیہ کو دلکش اور شائستہ انداز میں پیش کرنے میں ضرب المثل ہیں۔ خود پڑھئے اور ان کو پڑھایئے اور اس تبلیغی ادارہ کی رکنیت قبول فرما کر اس اہم تبلیغی تنظیم میں منسلک ہو جایئے:۔